قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل 1967

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

شائع کردہ •

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

اس کتاب کا برسوں سے انتظار تھا

اسلام کیا ہے

پرویز

ہمارا یہ دعوے ہے (اور مبنی برایمان دعوے) کہ اسلام، نوع انسان کی تمام مشکلات کا حل پیش کرتا ہے۔ لیکن جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ اسلام ہے کیا تو مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں اٹھتی ہیں جن کا ماحصل نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ کے مسائل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام صرف یہی ہے تو اس سے زندگی کے مسائل کا حل نہیں مل سکتا۔

اسلام ایک نظام حیات ہے جس کی بنیادیں چند غیر متبدل تصورات پر قائم ہیں۔ جب تک یہ تصورات واضح طور پر سامنے نہ آئیں، اسلام بحیثیت ایک نظام حیات کے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ضرورت تھی کہ ان تصورات کو واضح اور دلکش انداز میں یکجا پیش کیا جائے ــــ یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کر دیتی ہے۔

کتاب سولہ ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے ہر باب مصنف کے مدت العمر کے مطالعہ اور تدبر فی القرآن کا ماحصل پیش کرتا ہے۔ یہ کتاب:

(۱) ہمارے مذہب گریزہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ میں آجائے تو انہیں علی وجہ البصیرت اسلام کا گرویدہ بنا دے اور

(۲) غیر مسلموں کے ہاتھ میں دیدی جائے تو اسلام کے متعلق ان کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔

کتاب قریب پونے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور دو اقسام میں شائع کی گئی ہے۔

قسم اوّل۔ اعلیٰ سفید کاغذ۔ مضبوط جلد حسین گردپوش۔ قیمت فی جلد۔ آٹھ روپے۔

قسم دوم۔ مکینیکل پیپر۔ بکس بورڈ کور۔ قیمت فی جلد۔ چار روپے۔

فرمائش کے ساتھ اس کی تصریح کر دی جائے کہ کونسی قسم کی جلد مطلوب ہے۔

ملنے کا پتہ۔ ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی، گلبرگ، لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلیفون نمبر
۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ
طلوعِ اسلام
۲۵/بی
گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ
پاکستان | ہندوستان
ایک روپیہ | ڈیڑھ روپیہ

بدلِ اشتراک
پاکستان
سالانہ دس روپے
ہندوستان
سالانہ پندرہ روپے
غیر ممالک
سالانہ ایک پونڈ

جلد نمبر ۲۰ — اپریل ۱۹۶۷ء — نمبر ۴

فہرستِ مضامین

(۱) لمعات — ۲

(۲) یورپ کا ماضی کردار — محترم خورشید عالم صاحب — ۹

(۳) رابطۂ باہمی — ۳۱

(۴) کیا پاکستان اسلامی مملکت بن سکتا ہے؟ — ۱۷

(۵) تاریخ یا قرآن — ایمان کس پر ہونا چاہیئے — ۴۱

(۶) نقد و نظر — ۵۹

(۷) تاریخ طبری — (محترم علامہ تمنا عمادی صاحب) — ۶۵

(۸) باب المراسلات — (طلاق اور خلع) — (بچوں کو قرآن کیسے پڑھایا جائے) — ۷۷

ایڈیٹر۔ محمد خلیل - ناشر سراج الحق مقام اشاعت ۲۵-بی - گلبرگ - لاہور - پرنٹر شیخ محمد اشرف - مطبوعہ [illegible] پریس - ایبک روڈ - لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

بارہا گفتہ ام و بارِ دگر می گویم

۲۱ اپریل کو "یوم اقبال" قرار پانے کی بنا پر، ہمارے ہاں ایک قومی دن کی حیثیت حاصل ہے۔ یوم اقبال کی اس تقریب پر نہ صرف پاکستان میں، بلکہ بیرون پاکستان بھی بڑی اہم علمی مجالس منعقد ہوتی ہیں اور اس موقع پر فکرِ اقبال کے مختلف گوشوں پر اظہارِ خیال ہوتا ہے۔ کہیں اسے ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے خراجِ تحسین پیش کیا جاتا ہے اور کہیں اسے ایک مفکرِ جلیل کی حیثیت سے منظرِ عام پر لایا جاتا ہے۔ ان مجالس کے خاتمہ کے بعد ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اقبالؒ کی طرف سے جو فریضہ ہم پر عائد ہوتا تھا اسے ہم نے پورا کر دیا ہے۔

ایک طرف، ہر سال، یہ سب کچھ باقاعدگی سے ہوتا ہے۔ کئی سالوں سے برابر ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا چلا جائیگا۔ لیکن دوسری طرف جب انہی اقبالؒ کے پاکستان کے تصور اور اس کے مستقبل کی تعمیر و تشکیل کا معاملہ سامنے آتا ہے تو ہم اسے قطعاً نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اقبالؒ نے اس مملکت کا تصور کیوں دیا تھا۔ اس سے اُن کے پیشِ نظر مقصد کیا تھا۔ وہ مسلمانوں کے لئے ایک آزاد مملکت کا وجود کیوں ضروری سمجھتا تھا۔ ہمارے ہاں کے کئی بزرجمہر اُٹھتے ہیں اور اس مملکت کے نظام اور آئینی خاکوں کے متعلق وہ فلسفے بگھارتے، اور ایسی ایسی موشگافیاں اور نکتہ آرائیاں کرتے ہیں کہ اقبالؒ کی روح بھی یقیناً طلسمِ پیچ و تاب بن کر رہ جاتی ہوگی۔ کوئی کہتا ہے کہ پاکستان کا مطالبہ ہندوؤں کی تنگ نظری کی وجہ سے کرنا پڑا۔ دوسری طرف سے آواز آتی ہے کہ اس سے مقصد معاشی مفادات کا حصول تھا۔ اور بعض "بلند پرواز" یہاں تک بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ سب انگریز کا منصوبہ تھا۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اور ہر زبان اس کی مدعی کہ اقبال ـــــ یا ما یار بود ـــــ کس قدر تاسف انگیز ہے یہ حقیقت کہ پاکستان کے نام پر ایک خطۂ زمین حاصل کئے بیس سال پورے ہونے کو ہیں لیکن ابھی تک ہم یہ بھی متعین نہیں کر پائے کہ یہاں کس قسم کا نظامِ مملکت متشکل ہو۔ اس نظامِ مملکت میں کس قسم کا

رنگ عمل بھرا جائے۔ ہمارے دستور مملکت کا سرچشمہ اور قانون سازی کی اصل واساس کیا ہو۔ اور اقبالؒ کا اس سے مقصود و مطلوب کیا تھا۔

اقبالؒ کی بنیادی حیثیت ایک حکیم انقلاب کی ہے اور ان کی بصیرت قرآنی نے جہاں صدیوں کے بعد ہمیں از سر نو قرآن کی قوتِ انقلاب سے متعارف کیا وہاں اسی دعوتِ قرآنی کی روشنی میں ہماری جداگانہ مملکت کے حصول وقیام کی منزل کی بھی نشان دہی کی۔ اس لحاظ سے مملکت پاکستان کو تصور اقبال کے ایک جیتے جاگتے شاہکار کی حیثیت حاصل ہونی چاہیئے۔ اس نے جب ہمارے لئے اس جداگانہ مملکت کا مطالبہ کیا تھا تو اس کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرت پوری وضاحت سے یہ بھی بتا دیا تھا کہ مسلمانوں کی اس جداگانہ مملکت کے حصول وقیام کی وجہ جواز کیا ہے اور اس کا مقصود ومنتہیٰ کیا؟ مسلمانوں کے لئے ایک الگ خطۂ زمین کی ضرورت کیوں ہے اور انہوں نے یہاں کس قسم کا نقشہ قائم کرنا ہوگا؟ اس تاریخی حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب کسی شخص کو بھی مملکت پاکستان کی نظریاتی اساس کی تلاش میں سرگردانی کی ضرورت نہیں۔ نظام مملکت کی یہ اساس اسی دن سے طے شدہ ہے جب پہلی بار (۱۹۳۰ء میں) گنگ وجمن کے سنگم پر کھڑے ہو کر علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے صدارتی خطبہ میں اپنوں اور بیگانوں کے سامنے اس مملکت کا مطالبہ پیش کیا تھا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ

> ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے ..... اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا۔

یہ ایک اصولی حل تھا۔ آگے چل کر انہوں نے اپنے خطبہ میں اس کی وضاحت فرمائی اور یہ وضاحت ایک شدتِ آرزو بن کر یوں لبوں پر آئی۔

> میری آرزو ہے کہ پنجاب صوبہ سرحد سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے ہندوستان کو حکومت خود اختیاری زیر سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر مجھے کبھی ہو مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔
>
> (خطبۂ صدارت۔ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء)

اس سلسلے میں انہوں نے مزید کہا کہ

> اگر آج آپ اپنے تمام تصورات اور تخیلات کو اسلام اور صرف اسلام کے نقطۂ ماسکہ پر مرکوز کر دیں اور زندہ وپائندہ اور دائم وقائم نظریۂ حیات سے جو وہ پیش کرتا ہے، نور بصیرت حاصل کریں تو اس سے آپ اپنی منتشر قوتوں کو پھر مجتمع اور گم گشتہ مرکزیت کو از سر نو حاصل کر لیں گے۔ اور یوں اپنے آپ کو تباہی اور بربادی کے مہیب جہنم سے بچا لیں گے۔ (ایضاً)

لاریب کہ اسلام کے زندہ و پائندہ اور دائم و قائم نظریۂ حیات سے نورِ بصیرت حاصل کئے بغیر ہماری بگڑی نہیں بن سکتی لیکن یہی مقام پر وہ نازک سوال اُبھر کر سامنے آجاتا ہے جس کے علیٰ وجہ البصیرت حل نہ کئے جانے کے باعث ہم فکر و عمل کے شدید الجھاؤ میں مبتلا چلے آرہے ہیں۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ فی اصلہٖ اسلام کیا ہے؟ امت صدیوں سے مختلف فرقوں میں بٹی چلی آرہی ہے۔ ہر فرقے کا اسلام دوسرے فرقے سے مختلف ہے اور ان میں سے ہر فرقہ اس زعم میں مگن ہے کہ اس کا اسلام صحیح اسلام ہے اور باقی سب کا غلط۔ اس صورتِ حال کی موجودگی میں مذکورہ سوال کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ جب پاکستان کی جداگانہ مملکت کا تصور پیش کر رہے تھے تو وہ اس سوال کی اہمیت سے پوری طرح باخبر تھے اور انہوں نے مختلف مواقع پر اس حقیقت کو پوری طرح نکھار کر پیش کیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خطبات — تشکیلِ الٰہیات جدید — میں فرمایا تھا کہ

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کُلّی کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے۔ لیکن اس کی نمود تغیّر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلق کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مُستقِل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں اس لئے کہ دنیا میں، جہاں تغیر کا دور دورہ ہے۔ ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن ابدی اصولوں کے متعلق اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں — وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے — تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی و سیاسی دوائر میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

یہ حقیقت کشا حل پیش کرتے ہوئے اس حکیم انقلاب کی نگاہیں اس طبقہ کے ذہنی تاثر سے بے خبر نہیں تھیں جو مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور ان کے فقہی اختلافات کی بنا پر یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ ان اختلافات کی موجودگی میں یہ ممکن ہی نہیں کہ اسلام کی کوئی متفق علیہ شکل ایک نظامِ مملکت کی حیثیت سے نافذ العمل ہو سکے۔ علامہ اقبالؒ ایسے عناصر کی طرح اسلام کے مستقبل سے مایوس نہیں تھے۔ ان کی بصیرت قرآنی امیدوں کی ایک شمع روشن کر رہی تھی اور پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ

> مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اگر اسلامی قانون سے متعلق ضخیم لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو

اس سے دورِ حاضر کے ناقدین کے اس سطحی خیال کی تردید ہو جائے گی کہ اسلامی قانون جامد اور ناقابلِ ترقی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں کہ قانون سازی کے مسئلہ کے متعلق تنقیدی نقطۂ نگاہ سے گفتگو کی جائے۔ اگر کسی نے اس بات کو اٹھایا تو یہ اقدام بہت سے لوگوں کے لئے وجہ ناراضگی ہو جائے گا اور مخالفت کا دروازہ کھول دے گا۔ (خطبات - صفحہ ۱۵۶)

یہ کام بڑا اہم تھا اور اس کے لئے اقبالؒ ہی کے الفاظ میں۔

چیتے کا جگر چاہیئے۔ شاہیں کا تجسّس

علامہ اقبالؒ بخوبی سمجھتے تھے کہ اسلام کا مستقبل ایسے داعیٔ انقلاب کا منتظر ہے جو صدیوں کے رطب و یابس کو الگ کر کے دینِ خالص کو اپنی پاکیزہ اور منزہ شکل میں دنیا کے سامنے لے آئے۔ اُسے مخالفتوں کے ہجوم سے ضرور دوچار ہونا پڑے گا لیکن اپنی اس ہمت و جرأت اور قلندرانہ عمل سے وہ نہ صرف امت بلکہ پوری نوعِ انسانی کی تقدیر کو بدل کر رکھ دے گا چنانچہ انہوں نے فرمایا۔

میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کر دے گا وہی اسلام میں مجدّد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا محسن بھی وہی ہوگا۔۔۔۔۔۔ افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا۔۔۔۔۔ میری ناقص رائے میں اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر پرکھا جا رہا ہے اور شاید اسلام کی تاریخ میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

(اقبال نامہ - جلد اوّل - صفحہ ۵۰)

قیامِ پاکستان کے بعد بالآخر وہ وقت آ گیا جبکہ پوری اُمّت سے لڑائی مول لے کر اس سوال کا دو ٹوک حل پیش کرنے کی ضرورت تھی، اور یہ سہرا اسی کے سر بندھ سکتا تھا جو فرقہ بندی کے شرک سے کلیتہً بالاتر ہو اور علیٰ وجہ البصیرت یہ اعلان کر سکے کہ خدا کا دین اپنی مکمل ترین شکل میں کتاب اللہ کے اوراق میں محفوظ ہے اور اس شمع نورانی کی روشنی سے آنکھیں بند کر کے انسانوں کے خود ساختہ اور ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کی روشنی میں دوسری بارگاہوں سے راہنمائی کی تلاش میں بھٹکتے پھرنا خود دین سے روگردانی ہے۔ چنانچہ انہوں نے انتہائی واشگاف اور دو ٹوک انداز میں اعلان کیا کہ

یہ سوال زود یا بدیر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں

یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ ——— حسبنا کتاب اللہ۔ (خطبات اقبال)

ان کا یہ اہم اور تاریخی خطبہ حسب ذیل الفاظ پر ختم ہوتا ہے اور یہی وہ پیغام ہے جو اس حکیم الامت کے پورے پیغام کی رُوح اور منشاء و مقصود ہے۔

اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ (ختم نبوت کے) بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیل جدید کرے اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھائے جو اسلام کی اصل و غایت ہے۔ لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔

اسلامی مملکت کا منشاء و مقصود

اسلامی نظام مملکت کے قیام سے متعلق اس بنیادی مسئلہ کا یوں نکھرا ہوا حل پیش کرنے کے ساتھ حضرت علامہ نے اس نظام کے منشاء و مقصود کو بھی مختلف مقامات پر بڑی وضاحت سے پیش کیا۔ چنانچہ "معرکۂ دین و وطن" کے سلسلے میں (مولانا) حسین احمد مدنی مرحوم کے اخباری بیان کو گمراہ کن قرار دیتے ہوئے حسب ذیل الفاظ میں اعلان کرتے ہیں کہ

اگر عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے، تو سوائے نظام اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے.... نبوت محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔

وحدتِ انسانیہ کا علمبردار

علامہ مرحوم کے نزدیک اسلام کا نظام جسے پاکستان کی مثالی مملکت میں تشکیل کرنا مقصود تھا (اور مقصود ہے) کسی خاص قوم یا نسل سے مخصوص نہیں بلکہ یہ نوع انسانی کی عالمگیر وحدت و اخوت کا داعی اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا علمبردار ہوگا۔ چنانچہ ڈاکٹر نکلسن کے نام انہوں نے اپنے ایک خط میں لکھا کہ

اسلام بلکہ کائنات انسانیہ کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوع انسانی سے

محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علم جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود مملکت پر ہے دنیائے اسلام میں استیلا کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدرد نوع انسانی کی حیثیت سے انہیں یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشوو ارتقا ہے۔

معاشی مسئلہ کا حل

انسانی زندگی کے مسائل میں ایک اہم ترین مسئلہ زندگی کے معاشی تقاضوں سے متعلق ہے۔ اقوام عالم کی تقدیریں آج اسی محور پر گردش کر رہی ہیں اور جو ملک اور قوم اس مسئلہ کو اطمینان بخش طور پر حل نہیں کر سکی اقوام عالم میں اسے کوئی باعزت مقام حاصل نہیں اور اس کا اپنا معاشرہ ہر قسم کی پریشانیوں اور تلخیوں سے دوچار ہے۔ ایسی صورت میں یہ سوال ابھر کر سامنے آجاتا ہے کہ اسلام کے جس نظام نے پوری نوع انسانی کو اپنی آغوش رحمت میں لینا ہے کیا وہ اس مسئلہ کا کوئی ایسا حل پیش کرتا ہے جو انسان کو محض ایک مشین بنا کر نہ رکھ دے بلکہ اس کے جسم اور ذات دونوں کے نشوو ارتقا کا سامان مہیا کرے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ چنانچہ پورے یقین و اعتماد سے وہ قائد اعظمؒ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دور حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما (DEVELOPMENT) دیجا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامان پرورش (SUBSISTENCE) ضرور مل جاتا ہے۔

یہ تھا اسلامی مملکت کا وہ دل کش نقشہ جو اس داعیٔ انقلاب کی حسین ترین آرزوؤں کا مرکز و محور تھا۔ اسی کو محسوس و مشہود پیکروں میں متشکل دیکھنے کے لئے انہوں نے اس برصغیر کے مسلمانوں کے لئے جداگانہ مملکت کا مطالبہ کیا تھا۔ انکی یہ سہانی آرزوئیں (ایک حد تک) پوری ہوگئیں جب قائد اعظمؒ کے تدبر اور فراست سے یہ مملکت واقعی ایک جیتی جاگتی حقیقت بن کر دنیا کے سامنے آگئی۔ لیکن یہ آرزو ابھی بتمام و کمال پوری نہیں ہوئی۔ وہ اس دن پوری ہوگی جب پاکستان میں قرآن کا مثالی نظام متشکل ہوگا۔ خدا کرے کہ اقبالؒ کی یہ شدت آرزو جو پوری ملت اسلامیہ اور عالم انسانیت کی منزل مقصود ہے دولت خداداد پاکستان میں قرآنی نظام کے قیام سے حاصل مراد کو پہنچے۔ اس نظام کے قیام کے لئے مسلسل اور پیہم جدوجہد اقبالؒ کی صحیح یادگار قائم کرنے کا ذریعہ ہے۔ باقی جو کچھ ہے محض فریب نفس ہے۔

قرآنی فکر کو

اقبالؔ نے جہاں سے چھوڑا — پرویزؔ نے وہاں سے آگے بڑھایا

اس کی شہادت ان جواہر پاروں سے ملے گی۔

(۱) **سلیم کے نام خطوط** مذہب گزیدہ' تعلیم یافتہ نوجوانوں کو' علیٰ وجہ البصیرت' اسلام کا گرویدہ بنانے کے لئے ہلکے پھلکے لیکن شگفتہ و شاداب انداز میں تین جلدوں میں فکری شاہکار جس نے ملک میں بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔ اعلیٰ درجہ کی ٹائپ کی طباعت۔ جلد اوّل - آٹھ روپے۔ جلد دوم - چھ روپے۔ جلد سوم - چھ روپے مجلد

(۲) **سلسبیل** پرویز صاحب کے ان فکر انگیز۔ روح پرور مضامین کا مجموعہ جنہوں نے ملک کی فضا میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ عمدہ سفید کاغذ حسین طباعت۔ قیمت مجلد - آٹھ روپے۔

(۳) **بہارِ نو** مقالات و مضامین کا دوسرا مجموعہ۔ فکری انقلاب کے سلسلہ کی اگلی کڑی۔ ہر مقالہ پاکستانی منزل کی طرف لیجانے والی صاف اور سیدھی شاہراہ۔ قیمت - پانچ روپے۔

(۴) **انسان نے کیا سوچا؟** گزشتہ اڑھائی ہزار سال میں دنیا کے عظیم مفکرین نے انسانی زندگی کے اہم مسائل کا حل تلاش کرنے میں جو کاوشیں کی ہیں ان کا تفصیلی تعارف۔ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں گراں قدر کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دے گی۔ اعلیٰ درجہ کی طباعت۔ سفید کاغذ۔ بڑی تقطیع۔ قیمت مجلد بارہ روپے۔

(۵) **اسلام کیا ہے؟** سوال آپ کے سامنے ہے۔ اس کا جواب آپ کو اس کتاب سے اس انداز میں ملے گا کہ اس موضوع پر کوئی نکتہ وضاحت طلب باقی نہیں رہے گا۔ بڑی بلند پایہ تصنیف ہے۔ طباعت۔ کاغذ اعلیٰ۔ قیمت مجلد - آٹھ روپے۔

(۶) لغات القرآن

یہ قرآن کی لغات نہیں۔ اس کی تعلیم کا نچوڑ ہے۔ کتاب اللہ کے ایک ایک لفظ کی تشریح اور ایک ایک تصوّر کی وضاحت۔ مصنف کی مدت العمر کی قرآنی فکر کا ماحصل۔ چار پاکیزہ جلدوں میں۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد کی قیمت - بارہ روپے۔ مکمل سیٹ کی قیمت - پچاس روپے۔

ملنے کا پتہ: — ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ - لاہور

خورشید عالم

یورپ کا عالمی کردار

چین کے عالمی کردار کا مطالعہ کرتے ہوئے ضمنی طور پر، یورپ کے عالمی کردار کا ذکر آگیا تھا۔ یہ کردار اتنا اہم ہے کہ اس کے خصوصی تجزیے کی ضرورت ہے۔ دیکھا جائے تو عہد حاضر کا سنگین ترین مسئلہ یورپ ہی کا پیدا کردہ ہے۔ جب تک یورپی ذہنیت کو پوری طرح بے نقاب نہیں دیکھ لیا جائے گا، نہ یہ مسئلہ سمجھ میں آئے گا، نہ اس کے حل ہونے کے امکانات پیدا ہوں گے اور نہ انسان کو امن و سکون حاصل ہونے کے آثار دکھائی دیں گے۔

یورپ کا عروج و ارتقا ایک دلخراش داستان اور تاریخ انسانی کا گھناؤنا باب ہے۔ اقبال نے پوری بالغ نظری سے ساری کہانی کو ایک ہی مصرعہ میں سمو دیا ہے ـــــ تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال ـــ لیکن یورپ کچھ ایسے انداز سے قوموں کے لوح قلب و ذہن پر اپنی تصویر کھینچتا چلا آیا ہے کہ اس مصرعہ کو جھوم جھوم کر پڑھنے والے بھی اس میں بیان کردہ صداقت کا کماحقہٗ اعتراف آسانی سے نہیں کرپاتے۔ اس کی وجہ ناقابل فہم نہیں، یورپ کی نمود سے تاریخ عالم کا جو باب شروع ہوا اس کا باب ماسبق عرب یعنی مسلمان تھے، مسلمان نہ ہوتے تو یونانیوں کا علم، تاریخِ انسانی کا گم شدہ باب بن چکا ہوتا۔ اور شاید انسان ابھی تک جہالت ہی کے دور سے دوچار ہوتا۔ مسلمانوں نے یونان کے علم کو زندہ ہی نہیں کیا، اس میں نئی روح پھونک کر اور اسے اخلاق و اقدار کا تابع بنا کر آدمیت کو نئی اور اعلیٰ تقدیر سے روشناس کرایا۔ یورپ ان مسلمانوں ہی کا دریوزہ گر اور ان ہی کی پیداوار تھا۔ لیکن اس کے سر میں ایسا خناس سمایا تھا کہ اپنے آپ کو مسلمانوں کا پرتو سمجھنا تو بجائے خود رہا انہیں اپنا پیش رو تک کہنے کا روادار نہ رہا۔ اس نے مسلمانوں کے نقوشِ پا کو ایک ایک کر کے پامال کیا اور دنیا بھر کو یہ تاریخی فریب دیا، اور دیتا چلا گیا کہ اس کی نمود سے پہلے ہر سو جہالت کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ یورپ سے پہلے کا عہد قرونِ مظلمہ تھا۔ اس طویل عہد کی جہالت و ظلمت کو یورپ نے دور کیا اور اب وہی تہذیب و تمدن کی روشنی چار دانگِ عالم میں لئے لئے

پھر چاہتا ہے تاکہ انسان کرۂ ارض پر وہ فردوسِ گم گشتہ پھر سے حاصل کرے جہاں سے "شیطان اور عورت" نے اسے نکلوا دیا تھا۔ یورپ افرنگ کے قریے قریے کو فردوس کی مانند بنانے میں کامیاب تو ہو گیا لیکن ان قریوں کی رونق اسی شیطان اور اسی عورت سے ہے جنہوں نے انسان کو جنت میں ٹکنے نہیں دیا تھا۔ اب یورپ کے جادو کا اثر زائل ہونے لگا ہے تو انسان یہ پکارنے پر آ گیا ہے کہ یورپ نے اسے جو کچھ جنت کہہ کے دیا وہ جہنم سے بھی بدتر ثابت ہوا۔ یورپ وقت کی زبان کو لگام تو نہیں دے سکتا لیکن وہ دیوانہ وار اسی جہنم کو بھڑکاتے چلا جا رہا ہے تاکہ وہ اس بہشت کو بھی لے کر اپنے دوزخ میں ڈال دے جو انسان نے اپنے تصور میں آباد کر رکھا ہے۔

یورپ تاریخ عالم کے ایسے مرحلے میں نمودار ہوا جب زمین میر و سلطان سے بیزار ہو چکی تھی اور تخت و مصلّٰی کے کمالِ زرّاقی کا بھرم کھل چکا تھا۔ فرانس نے قصرِ شاہی کے نشیمن سے ملوکیت کے گندے انڈے اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دیتے تھے، اور "حریت، اخوت اور مساوات" کا علم بلند کر کے جمہور یورپ کو ایک نئی منزل کا نشان دیا تھا۔ جرمنی میں لوتھر کی بغاوت نے ان اطواق و سلاسل کے توڑنے کی طرح ڈال دی تھی جن سے پاپائیت نے قلوب و اذہان کو مقید کر رکھا تھا۔ یہ روئیدگی قدرتی نتیجہ تھی اس بیج کا جو مسلمان یورپ کی کھیتی میں بو چکا تھا لیکن یورپ نے اسے ایسا زہریلا پیوند لگایا کہ جب یہ فصل پک کر تیار ہوئی تو انسان کی جھولی میں وہ میوۂ تلخ آ کے گرا کہ اس کے کام و دہن اس کے مزے سے آسانی سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکیں گے۔ یورپ میں ملوکیت کی جگہ جمہوریت نے لی وہ یورپی حدود سے نکلی تو عریاں استعماریت بن گئی۔ عیسائیت کی مرکزیت ختم ہوئی تو بالائے قومی اقدار و تصورات کا رہا سہا چلن بھی جاتا رہا۔ جو کسر رہ گئی تھی وہ مشینوں کی ایجاد نے پوری کر دی۔ مشینوں نے اقوام یورپ کو جنگلی درندے بنا دیا۔ نت نئی اختراعات نے رسل و رسائل اور بار برداری کے ایسے محیر العقول ذرائع مہیا کر دیئے کہ دولت آفرینی کا میدان عالمگیر ہو گیا۔ اقوام یورپ قزاقوں کی طرح اپنے گھروں سے نکلیں اور بحر و بر پر چھا کر اطراف و اکناف میں لوٹ مار کا بازار گرم کرنے کا موجب بن گئیں۔ "ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدیهم" کی بھرپور تفسیر جتنی یورپ نے مہیا کی، تاریخ میں شاید ہی کسی اور قوم نے کی ہوگی۔ مختلف ممالکِ یورپ آج جن افرادِ قومی کو اپنا بطلِ جلیل اور سمندر پار سلطنتوں کے بانی و معمار کہہ کے یاد کرتے ہیں انہیں انسانی اخلاق و اقدار کے آئینے میں دیکھا جائے تو وہ عہدِ عتیق کے دیو ہیکل اور خونخوار درندے دکھائی دیتے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ فطرت نے ان صورتوں کو خاک میں پنہاں نہیں کیا بلکہ انہیں یورپی انسان کا روپ دے کر اور مشینوں میں لا کر بساطِ تاریخ پر نمایاں کر دیا ہے۔

افرنگ کے عالمی غلبہ و استیلاء کی تاریخ کا مطالعہ ذہن میں یورپی کردار کی جو تصویر ابھارتا ہے وہ اس سے مختلف نہیں کہ فطرت کے پنجرے سے چند بھیڑیئے نکل کر گہوارۂ عالم میں پھیل گئے اور ہر طرف تباہی مچا دی۔ افرنگ — بقول اقبال — جز یسفک الدماء و خصیم مبین نبود!

ترکوں سے کئی کئی لڑکے اور ترکوں لہذا مسلمانوں کی نفرت کا اُبتلا لا عام لیتے۔ یورپ سمندروں کے راستے ایشیائی اور افریقی ممالک میں پہنچا۔ اسے مسلمانوں کی طاقت کو بھی ختم کرنا تھا، اور لوحِ تاریخ سے اس حقیقت کو بھی حرفِ غلط کی طرح مٹانا تھا کہ اسلام ہی انسانیت کی تقدیر بھی ہے اور اس تقدیر کی تشکیل کا واحد ذریعہ بھی۔ چنانچہ یورپی ملاحوں کی زینی دریافتوں کا آج بھی ذکر ہوتا ہے تو جہاں ان کی خطر پسندی اور مہم جوئی پر زور دیا جاتا ہے، وہاں اس کا جواز یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ بحری راستے اس لئے بھی تلاش کرنے پڑے کہ آمد و رفت کے بری راستے لٹیروں کے ہاتھوں غیر محفوظ ہو گئے تھے۔ یہ "لٹیرے" ترک تھے جن کی شوکت و سطوت نے یورپ کے قلب پر صدیوں ہیبت طاری کئے رکھی۔ مسلمانوں کا دوسرا اہم مرکز جس کا دنیا بھر میں شہرہ تھا، ہمارے برصغیر کی مغلیہ حکومت تھی۔ فرنگی لٹیرے بھیس بدل بدل کر اور نفرت اور درندگی کے دشنہ اور خنجر سمیٹ سمیٹ کر یہاں وارد ہوئے اور استحصال، اور سلب و نہب کے ناقابلِ یقین طریقے آزمانے لگے۔ انہوں نے سب سے پہلے مشرقی پاکستان کے علاقوں میں سازشوں کے جال پھیلائے۔ اپنی تہذیب اور ترقی کا شیشہ دکھا کر اس میں پورے مشرق کی پری کو اتارا۔ اسے بدصورت اور غیر مہذب کہا اور کہلوایا۔ مسلمانوں کو جنونی کا نام دیا اور عام طور پر ازبر کرایا۔ ان کی تاریخ کو مسخ کر کے انہی کے بچوں کو پڑھانے اور یاد کرانے بیٹھ گئے۔ اس طرح ان کی توجہ اپنے آپ سے ہٹا کر انگریز نے ان کی نگاہوں میں لندن اور پیرس کے جلوے بھر دیئے اور چند نسلوں میں یہ حال کر دیا کہ حریم تو مشرق یا مسلمان کا ہے، لیکن خودی اس میں یورپ ہی کی کارفرما ہو۔ سیاسی اور معاشی قزاقی اس کے ساتھ ساتھ جاری رہی ——— بے دریغ! اور بے ڈھنگ! انگریزی سلطنت کی بنیادیں رکھنے والے اوباش، آبرو باختہ اور اپنی معاشرت کے دھتکارے ہوئے لوگ تھے۔ استبداد میں وہ اتنے آگے بڑھ گئے تھے کہ یورپ کا پتھر دل بھی خلش و اضطراب کی کسک محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہاں کی لوٹ کھسوٹ سے انگریز نے اپنے ہاں چہل پہل پیدا کی۔ یہاں کے صناعوں اور کاریگروں کو دھوکے دے دے کر بھی وہ اپنے کارخانے نہ چلا سکا تو اپنے ہاں مشرقی پاکستان کی مصنوعات کو ممنوع ٹھہرا دیا۔ ڈھاکے کی یکتائے زمانہ ململ کا پہننا جرم قرار پا گیا۔ پھر بھی ان ملبوسات کا استعمال نہ رکا تو یہاں کے ہنرمندوں کے ہاتھوں کے انگوٹھے کٹوا کٹوا کر صنعت و حرفت کو برباد کر دیا گیا۔ انگریز یہ دجل و فریب اور جور و تعدی روا نہ رکھتا تو مانچسٹر اور لنکاشائر کے کارخانوں کا کوئی نام بھی نہ جانتا۔

تہذیب کے نام پر نفرت کا جو انبار لے کے انگریز یہاں پہنچا وہ سارے کا سارا اس نے تاریخ کے صفحات پر بکھیر دیا۔ آج ہم اسے جاہلانہ بکواس ہی کیوں نہ قرار دیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ انگریز نے یہ کہا اور ہم نے اسے تسلیم کیا کہ انگریزی زبان کا ایک فقرہ مشرق کی پوری لائبریریوں پر بھاری ہے۔ یہ اس انگریز نے کہا جس کے دارالحکومت ——— لندن ——— کی گلیوں میں اس وقت اندھیرے اور کیچڑ کا دور دورہ تھا جب قرطبہ شہر کی روشنی آس پاس کے

میلوں علاقے کو وقت کی طرح منور رکھتی تھی۔ لندن آٹھ سو سال بعد تک بھی تہذیب اور ترقی کی اس سطح پر نہیں آ سکا تھا۔ اس انگریز اور اس کے یورپی بھائی بندوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے متعلق یہ اعتراف کیا تھا کہ وہ اتنے روشن دماغ اور باخبر ہیں کہ اہل یورپ ان کے سامنے بات کرنے سے گھبراتے ہیں۔ اس قوم کی نفسیات یورپ نے یہاں تک بدل دی تھی کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل و حقیر سمجھنے لگ گئی اور پھر ان کی محفل میں جو اپنے آپ کو صف نعال میں جگہ پانے کے قابل نہ سمجھتے تھے، ان کی جوتیاں سیدھی کرنے میں اپنی عزت سمجھنے لگی۔ یورپ نے دیگر اقوام کو غلام بنا کر سیاسی، معاشی اور معاشرتی اعتبار سے بے چارہ بنانے پر اکتفا نہ کی۔ اس نے ان کی تاریخ بدل کے یہ انتظام کیا کہ وہ احساس ذات سے عاری ہو جائیں اور اپنے آپ کو حقیر جان کر اپنی ذات سے نفرت کرنے لگیں۔

انگریز کو مخصوص یورپی ذہنیت کا نمائندہ سمجھ کر میں اسی کے کردار کا تجزیہ کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ کہا جاتا ہے ——— اور کہنے والے خود ہم ہیں ——— کہ انگریز نے اپنی سلطنت قائم کرنے کے لئے ابتداءً بعض مظالم روا رکھے لیکن بعد میں جب آئینی دور شروع ہوا تو وہ غیر جانبدار اور منصف مزاج بن گیا۔ انگریز کا آئینی دور ۱۸۵۸ء میں شروع ہوا۔ لیکن جس ظالمانہ بلکہ مجرمانہ یورپی ذہنیت کا نمائندہ وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے تھا، اس کا نمائندہ وہ ۱۸۵۷ء کے بعد بھی رہا، اور اب تک ہے۔ جب بھی اسے ضرورت محسوس ہوئی وہ درندگی کے ہی سامنے آیا۔ ۱۸۵۷ء میں اس نے جس طرح ہماری بستیوں کو غارت کیا اور ہمارے اعزہ کو اذلہ میں تبدیل کیا، اسی طرح وہ منظم حکمت عملی کے تحت کرتا چلا گیا۔ پٹنہ کے مجاہدین کے ساتھ اس نے پوری بربریت کا سلوک کیا۔ ہماری قبائلی سرحد پر ظلم و تشدد تخویف، ترہیب، تحریص، غرض کون سا حربہ تھا جسے وہ آخر دم تک استعمال نہیں کرتا رہا۔ ترکی کے ساتھ پہلی جنگ عظیم کے بعد اس نے کیا سلوک کیا؟ ۱۹۱۹ء کے مارشل لاء میں اس نے ہمارے ہاں کتنی درندگی کا مظاہرہ کیا۔ ۱۹۴۷ء میں اس نے کیا کیا گل نہیں کھلائے۔ مسلمانوں کے قتل عام میں انگریز کا برابر کا ہاتھ ہے۔ کشمیر کے سینے پر جو خنجر پیوست ہوا، اس کے قبضے پر انگریز کا پنجہ کس کو دکھائی نہیں دیتا، پھر بھی ہم شہادت دیتے پھرتے ہیں کہ انگریز نے بڑی خوش دلی سے ہمیں آزادی دی! ——— انگریز کے بس کی بات ہوتی تو پاکستان اول تو قائم ہی نہ ہوتا۔ اور اگر ہو جاتا تو چند دنوں میں ہی اس کا گلا گھٹ جاتا۔ ہمیں اور کچھ یاد نہیں رہ گیا ہو تو یہ تو نہیں بھولے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا ہم نے پاکستان میں داخلہ بند کر رکھا ہے۔ یہ لارڈ انگریزی (یورپی) ذہنیت ہی کا تو نمائندہ ہے۔ جو کچھ اس نے کیا وہ انگریز ہی نے کیا اور کرایا۔ داخلہ تو دراصل انگریز کا بند ہونا چاہیئے تھا۔ یہ بھی یورپی شعبدہ بازی کا کرشمہ ہے کہ ہم گڑ تو بدستور کھاتے چلے جا رہے ہیں لیکن گلگلوں سے ...... پرہیز ہے۔

انگریز نہ خوش دلی سے گیا نہ جا کے خوش ہے۔ وہ دھوکہ دے کر آیا اور دھوکہ دے کر گیا۔ اس نے آکر بھی جتایا کہ ہم پر اس نے احسان کیا ہے اور جا کر بھی یقین دلایا کہ یہ اسی کا احسان ہے۔ پاکستان کے قیام کے لگ بھگ

وہ فلسطین سے بھی گیا جس طرح وہ گیا اس کی تفصیل "طلوع اسلام" میں آ چکی ہے۔ اس کا جانا ایک تاریخی سازش ہے۔ وہ فلسطین میں موجود تھا تو یہودیوں کو اس سرزمین میں آباد کرتا رہا اور گیا تو جاتے جاتے فلسطین کو یہودیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ گیا۔ انگریز کی شرارت کے بغیر فلسطین میں اسرائیلی حکومت کبھی قائم نہ ہو سکتی وہ یہ سارا بندوبست کر کے گیا اور دنیا کو یقین دلانے بیٹھ گیا کہ وہ زیادہ دیر تک فلسطین کو غلام بنا کے نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں یہی انگریز اپنے ساتھ فرانس اور اسرائیل کو لے کر مصر پر چڑھ دوڑا۔ اس عریاں اور سرتاسر بے جواز جارحیت کی توقع انگریز ایسی مہذب یورپی قوم ہی سے ہو سکتی تھی۔ روڈیشیا میں انگریز نے بعینہٖ یہی چال چلی۔ اس ملک کو، زمانے بھر کی آنکھ میں خاک جھونک کر، انگریز نے آنِ واحد میں نا خواندہ سفید فام اقلیت کے حوالے کر دیا۔ اور نام نہاد دولتِ مشترکہ کی مشاورت کا ڈھونگ کھڑا کر کے اس کوشش میں لگ گیا کہ افریقہ کے چہرے پر برص کا جو ایک اور داغ نمودار ہو گیا ہے اس کا کوئی مداوا نہ ہو سکے۔ وہ اس حکومت کو باغی کہتا ہے لیکن باغی کی سرکوبی کے لئے نہ خود کوئی قدم اٹھاتا ہے، اور نہ دوسروں کو اٹھانے دیتا ہے۔

علم و ہنر اور اخلاق و اقتدار کا دم بھرتے یورپ تھکتا نہیں۔ یہ سب اوزار ہیں اس تہذیب کے جس کے پردے میں وہ غارت گری اور آدم کشی میں مصروف رہا ہے۔ اس نے توموں اور ملکوں کی بنیادیں ہلا کے رکھ دیں۔ اس کی آمد کے بعد راجدھانیاں باقی رہ گئیں، راجے اور راج ختم ہو گئے۔ اپنے ہاں اس نے عیسائیت کو تقریباً خیرباد کہہ دیا لیکن مقبوضہ علاقوں میں اس نے پادریوں کی کھیپوں کی کھیپیں بھیجیں نہیں طرح طرح کی مراعات بخشیں، مقامی آبادیوں کو عیسائی بنانے کے لئے مکر و ریا سے کام لیا۔ اس کی پوری کوشش یہ رہی کہ اقوام مشرق اپنے آپ میں نہ رہیں، ذلت اور نکبت کی زندگی پر قانع ہو جائیں اور یورپ کی عظمت اور برتری کے گیت گائیں۔ اس کی کوشش کیا خواہش تک نہ تھی کہ ان قوموں کا درجہ بلند ہو، اور وہ اس کے پہلو بہ پہلو کھڑی ہوں۔ یورپ کے کردار کا یہ پہلو مسلمانوں کی مثال سامنے رکھنے سے اور واضح ہو جائے گا۔ مسلمان اسلام کا علم لے کے عرب سے نکلے تو انہوں نے اپنے حسنِ کردار سے قوموں کی قوموں اور ملکوں کے ملکوں کو مسلمان بنا دیا۔ لیکن جب غیر مسلم اقوام مسلمان ہو گئیں تو مسلمانوں اور نومسلموں میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ اس کے برعکس، یورپی اقوام نے عیسائیت کو اپنے عزائم مشئومہ کا ذریعہ بنایا۔ اس طرح نو عیسائیوں کی دو قسمیں معرضِ وجود میں آئیں۔ وہ جن کا رنگ سفید تھا، یوریشین کہلائے۔ ہمارے ہاں انگریز کی مناسبت سے اینگلو انڈین اور اینگلو پاکستانی پیدا ہوئے) جن کے رنگ سفید نہیں تھے، مقامی عیسائی کہلانے لگے۔ عیسائیوں کی دونوں قسمیں اہلِ یورپ کی ہمسری کا خواب بھی نہیں دیکھ سکیں۔ لیکن یہی یورپ کی مطلوبہ پیداوار تھی۔

یورپی تو نہ انہیں بننا تھا اور نہ بنے، لیکن وہ مشرقی نہیں رہے۔ یہی نہیں کہ وہ مشرقی نہیں رہے بلکہ وہ مشرق سے، انگریز سے بھی بڑھ کر نفرت کرنے لگ گئے۔ اس برصغیر کو پوری طرح عیسائی بنا لینے کی منظم کوششیں ہوئیں۔ یہ اسلام کی قوت مدافعت تھی کہ وہ ساری کی ساری ناکام ہوئیں، ورنہ انگریز نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔

اقوام یورپ نے عالمی سطح پر تو نسل اور رنگ کے امتیاز کا انسانیت سوز مظاہرہ کیا۔ لیکن آپس میں قومی اور وطنی تعصب کو روا رکھا۔ یورپی کردار کے دونوں پہلو زہرناک ہیں۔ اس صدی میں یہ ذہنیت دو مرتبہ عالمگیر تصادم برپا کر چکی ہے۔ یورپ نے اس سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ انسانی اقدار کو یہ جس طرح روندتا چلا آیا تھا، اسی طرح روندتا چلا جا رہا ہے۔ پہلی جنگ کے بعد اس کے ذہن نے جمعیت اقوام کا تصور ابھارا۔ کہنے والے نے بالکل بجا کہا ـــــ

بہرِ تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند!

ـــــ اس ادارے کی معرفت یورپی اقوام کی انفرادی خرمستیوں کی یا تو پردہ پوشی کی گئی یا ان کے لئے فضا سازگار کر کے ان کا جواز مہیا کیا گیا۔ چنانچہ یہ ادارہ جو قیام امن کے لئے معرضِ وجود میں آیا تھا، دنیا کو دوسری عالمی جنگ میں جھونکنے کا موجب بن گیا۔ دوسری جنگ کی راکھ کریدکر یورپ نے اقوام متحدہ کا ڈھانچہ کھڑا کیا۔ اس کے عزائم، مقاصد اور اعلانات کو دیکھا جائے تو یوں لگتا ہے جیسے دنیا ایک جنت بنا دی جائیگی۔ لیکن اس کا عمل دیکھا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ پرانی سیاست گری خوار کیا ہوتی الٹی پختہ تر ہو گئی ہے۔ اقوام متحدہ کا کردار، "نشستند و گفتند و برخاستند" سے آگے نہیں بڑھنے دیا گیا۔ جب کسی یورپی قوم کے مفاد پر زد پڑتی ہے تو یہ ادارہ فوراً حرکت میں آجاتا ہے ورنہ لمبی تان کے سویا رہتا ہے۔ عالمی مسائل اس ادارے میں لاکر گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا دیئے جاتے ہیں اور اقوام یورپ کو جو کچھ کرنا ہوتا ہے وہ اسے پسِ پشت ڈال کر کئے جا رہی ہیں۔

دوسری جنگ کے بعد، یورپ کی سرداری امریکہ کو مل گئی ہے۔ چنانچہ امریکہ مخصوص یورپی ذہنیت کا نمائندہ اور مظہر بن گیا ہے۔ وہ بڑی ڈھٹائی سے ان استعماری یورپی قوموں کا کردار اپنا رہا ہے جو مقبوضہ علاقوں سے نکلنے پر مجبور ہو گئیں ہیں۔ اس کے بیڑے دنیا بھر کے سمندروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کہیں پتہ بھی کھٹکتا ہے تو یہ جھٹ پہنچ جاتے ہیں اور نہ اقوام متحدہ کا کچھ پاس کرتے ہیں نہ بین الاقوامی اقدار و ضوابط کا۔ گویا دعوے تو اقوام متحدہ کے ذریعے قانون کی بالادستی کے باندھے جاتے ہیں لیکن عملاً لاقانونیت کو فروغ دیا جاتا ہے۔ یورپ نے تو دراصل روزِ اول ہی سے قانون کا احترام کرنا نہیں سیکھا۔ قانون کا واسطہ تو وہ دوسروں کو

دیتا ہے۔ اور اپنے تئیں قانون سے بلند تر سمجھتا ہے۔ اپنی بلندی وہ طاقت میں سمجھتا ہے اور طاقت کے حصول میں دیوانہ وار لگا ہوا ہے۔ اس کا فلسفہ بقائے انفع کا نہیں بقائے اصلح کا ہے۔ اس کی طاقت کا راز سائنس اور سائنس کی ایجادات میں مضمر ہے۔ حیوانات کے مشاہدے اور مطالعے سے اس نے یہی اصول وضع کیا اور اسی کو وہ انسانی زندگی کا اصول سمجھتا ہے۔ یہ اصول کس حد تک غلط ہے، اس کا اندازہ اسکے اپنے مفکرین کے واویلے سے ہو سکتا ہے۔ جب موٹر کاروں ہی کا دور دورہ تھا تو ایک امریکی مورخ تہذیب نے کہا تھا ـــ یہ درست ہے کہ لاکھوں، کروڑوں افراد آج کاروں میں سوار ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ جا کہاں رہے ہیں؟ یورپ نے اُڑنا سیکھا تو ایک فرانسیسی مورخ تہذیب نے صاف طور پر کہہ دیا ـــ بادلوں کے اوپر اڑنے سے انسانیت کا درجہ تو بلند نہیں ہو سکتا۔ لیکن یورپ نہ انسان کا درجہ بلند کرنا چاہتا ہے نہ انسانیت کا۔ وہ رنگ اور نسل کے اعتبار سے اپنے آپ کو غیر یورپی دنیا سے افضل و اعلیٰ سمجھتا ہے اور ان سے نفرت بھی کرتا ہے اور اس کوشش میں رہا اور رہتا چلا آیا کہ وہ قومیں اپنے آپ سے نفرت کرنا سیکھ جائیں اور اسے ایسا خدائی فیصلہ سمجھیں جسے دل کی گہرائیوں سے قبول کر لینا چاہیئے۔

تاریخ میں ہلاکو اور چنگیز خان کو عذابِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے واقعی بڑے وسیع پیمانے پر انسانوں کو تہ تیغ اور انسانی بستیوں کو تہ و بالا کر دیا۔ ان کی تباہ کاری اس حد تک بیان سے باہر ہو گئی تھی کہ ایک عرب مورخ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا کہ ـــ ہمارے ساتھ ہوا جو ہوا۔ یہ سب اپنی جگہ بجا اور درست، لیکن آج پیچھے مڑ کے دیکھا جائے تو فتنۂ تاتار فتنۂ یورپ کے سامنے ہیچ دکھائی دے گا۔ تاتاریوں نے ایک حصہ زمین پر قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ انہوں نے نہ اپنے آپ کو اقدار و اخلاق کا علمبردار کہا، نہ دوسروں سے اس کا یہ جبر و اکراہ اقرار کرایا۔ انہوں نے قتلِ عام کیا لیکن تاریخ میں تحریف کے مرتکب نہ ہوتے۔ انہوں نے سلطنتوں کی سلطنتیں مٹا دیں لیکن اس کی نہ خواہش کی نہ کوشش کہ ان کے مغلوب انہیں ارفع و اعلیٰ سمجھیں اور خود کو حقیر و ذلیل سمجھ کر اس درجے کو دل وجان سے قبول کر لیں۔ یورپ نے پوری کوشش کی کہ ـ "باقی نہ رہے شیری کی شیری کا فسانہ" پھر اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ شیروں کی اولاد شیروں کو روباہ کہے اور صرف ایک شیر کی ہستی کا اعتراف کرے جو یورپ سے نکلا ـــ اور انسانوں کی دنیا میں جنگلی درندے سے بہتر ثابت نہ ہو سکا۔ آج عالمی سیاست پر نظر ڈال کر دیکھا جائے تو ایک ہی نقطہ ابھر کر سامنے آئے گا اور پوری عالمی سیاست اسی کی تعبیر دکھائی دے گی۔ یہ نقطہ ہے وہ عذاب جو انسان کی شامتِ اعمال کی بدولت یورپ کی صورت میں دنیا پر نازل ہوا۔

ایشیا اور افریقہ کی جو قومیں آزادی سے ہم کنار ہو چکی ہیں، وہ ساری کی ساری گردابِ قیادت میں پھنسی ہوئی ہیں۔ ان کے سامنے نمونہ یورپ ہے ـــ "برونِ خویشتن آخر چہ دیدی؟" کی نفسیاتی مجبوری کے پیشِ نظر

وہ نہ یورپی بن سکتے ہیں، نہ انہیں بننے دیا جاتا ہے — اور نہ انہیں بننا ہی چاہیئے۔ وہ یورپ کی چال چلنے کی اضطراری کوشش میں اپنی چال بھولے ہوئے ہیں۔ ان سب کی مشکل ایک ہے، اور وہ یہ کہ — کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے! — اور یہ اس لئے ہے کہ یورپ نے ان کی خودی کی نفی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ جب تک اپنے حریم میں وہ اپنی خودی بیدار نہیں کر لیتیں اور پوری طرح اپنے آپ میں نہیں آجاتیں، ان کے ہاں زندگی — اور قیادت — کے چشمے نہیں پھوٹ سکتے۔ اور یہ انقلاب اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ یورپ کو ہم جوار سمجھنا ترک نہیں کر دیں گے اور ان ستاروں کی راہنمائی قبول نہیں کریں گے جو انکے نشیمن سے قریب بھی نہیں اور ان کے اپنے مقدر کے ستارے بھی نہیں۔

رابطۂ باہمی

سابقہ کنونشن میں مجلہ طلوعِ اسلام کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں جو پروگرام طے پایا تھا، بزمیں اسے تکمیل تک پہنچانے کے لئے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں مصروفِ جدوجہد ہیں۔ اس وقت بزم لاہور، بزم کراچی، بزم راولپنڈی، بزم سرگودھا، اور بزم لائل پور ایک دوسرے سے بڑھنے کی فکر کر رہی ہیں۔ محترم محمد شریف لون صاحب، سرگودھا سے تبدیل ہونے کے بعد، میانوالی تشریف لے گئے ہیں۔ اور وہاں کی بے برگ و گیاہ سرزمین میں، قرآنی فکر کی تخم ریزی اور آبیاری میں مصروفِ کار ہیں۔ امید ہے وہاں کی بزم بھی چند دنوں میں باقی بزموں کے ساتھ دوش بدوش چلنے کے قابل ہو جائے گی۔ آئندہ کنونشن تک امید ہے کہ باقی بزمیں بھی اپنی اپنی ذمہ داروں سے بڑھ کر کامیابی کے نتائج پیش کریں گی۔

۲۔ مجلہ طلوعِ اسلام کی اشاعت کے علاوہ، پمفلٹوں کی تقسیم کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اور درسِ قرآن کریم کا بھی — انفرادی طور پر فکری نشر و اشاعت کا پروگرام بھی اطمینان بخش نتائج پیدا کر رہا ہے۔

خلوص اور محنت کے نتائج ہمیشہ اطمینان بخش ہوتے ہیں۔ اللّٰھم زد فزد

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

کیا پاکستان اسلامی مملکت بن سکتا ہے؟

(اے مسلمان! پوچھ اپنے دل سے مُلّا سے نہ پوچھ)

ہم نے یہ سوال اٹھایا تو اس کے ساتھ ہی ہماری نگاہوں کے سامنے آپ کا وہ خندۂ زیرلبی' تماشائے عبرت بن کر آگیا جو آپ کے اس احساس کا پیدا کردہ ہے کہ یہ سوال اس طلوعِ اسلام کی طرف سے اٹھایا جا رہا ہے جو ۱۹۳۸ء سے مسلسل و متواتر یہ پیغام دیتے آ رہا ہے کہ اسلام ایک زندہ حقیقت بن نہیں سکتا جب تک اس کی اپنی آزاد مملکت نہ ہو۔ پاکستان کا مطالبہ اس بنیاد پر پیش کیا گیا تھا کہ یہ جاسے ایمان کا تقاضا ہے۔ اس خطۂ زمین کو حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا گیا تھا کہ اس میں صحیح اسلامی نظام قائم کیا جائے۔ اس سرزمین کے تحفظ کی ہر کوشش اس لئے چاہیے کہ اسے نظامِ خداوندی کی تشکیل کا گہوارہ بننا ہے۔ قوم کے ذہن میں یہ تصورات طلوعِ اسلام نے پیدا کئے۔ اس کے دل میں اس مقصد کی عظمت و اہمیت کو اجاگر اس نے کیا۔ اس کے لئے اس نے (تقسیم سے پہلے) انگریز، ہندو، قومیت پرست علماء، جماعتِ اسلامی — غرضیکہ ہر اس قوت اور تحریک سے لڑائی مول لی جو اس مطالبہ کی مخالف تھی۔ اور (تقسیم کے بعد) اس نے ہر اس عنصر کا مقابلہ کیا جو اس مملکت کے اسلامی بننے کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتا تھا (اور کرتا ہے)، اب اسی طلوعِ اسلام کی طرف سے یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے کہ اس مملکت کے اسلامی بننے کا امکان بھی ہے یا نہیں؟ آپ کی حیرت بھی بجا' اور (جیسا کہ آپ آگے چل کر دیکھیں گے) اس سوال کا اٹھایا جانا بھی درست ہے۔ لیکن (اس حقیقت کو ہم شروع ہی میں واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ) اس سوال سے آپ کے دل میں ناامیدی کی کوئی رمق پیدا نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سے ہمارا مقصد آپ کو اس سوال پر غور و فکر کی دعوت دینا ہے کہ جو عناصر یہاں اٹھارہ سال سے کارفرما ہیں، اگر ان کی کارفرمائی بدستور جاری رہی، تو کیا یہ ملک اسلامی بن سکے گا؟ اس سلسلہ میں ہم آپ سے گزارش

کریں گے کہ جو کچھ آپ کے سامنے پیش کیا جائے آپ اس پر خالی الذہن ہو کر غور کریں۔ اس پر نہ تو اپنے ذاتی جذبات کو اثر انداز ہونے دیں اور نہ ہی کسی خارجی پروپیگنڈہ کی رو میں بہ جائیں۔ یہ سوال بڑا اہم اور سنجیدہ ہے۔ اس کا تعلق پاکستان کی ایک الگ آزاد مملکت کی ہستی کی وجہ جواز سے ہے۔ اس کا ہماری، آپ کی، اور آنے والی نسلوں کی زندگی سے گہرا رشتہ ہے۔ اس لئے یہ سوال آپ کی گہری توجہ کا محتاج ہے۔

ملک کے اسلامی بننے کا مفہوم

کسی ملک کے اسلامی بننے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں اسلامی قوانین نافذ ہوں اور وہاں کا معاشرہ اسلامی اقدار کے خطوط پر متشکل ہو۔ اس وقت ہم صرف اس کے پہلے گوشے — یعنی اسلامی قوانین — سے متعلق گفتگو کریں گے۔ بہ ظاہر ہے کہ کسی ملک میں اسلامی قوانین اسی صورت میں نافذ ہو سکتے ہیں جب وہاں اسلامی قوانین مرتب کئے جائیں۔ لہذا سوال یہ سامنے آئے گا کہ کیا پاکستان میں (بہ حالاتِ موجودہ) اسلامی قوانین مرتب ہونے کی کوئی صورت ہے؟

یہ بھی ظاہر ہے کہ پاکستان میں غیر مسلموں کی مختصر سی اقلیت کو چھوڑ کر، باقی آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے، اور مملکت کا اسلامی قانون وہی ہو سکتا ہے جس کا اطلاق ان تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو۔ لہذا یہ سوال سمٹ کر یہ شکل اختیار کر لیتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ پاکستان میں ایک ایسا ضابطہ قوانین مرتب کیا جا سکے جسے یہاں کے رہنے والے تمام مسلمان اسلامی قوانین تسلیم کریں؟

کسی ملک میں قانون سازی کا بنیادی اصول، اس کے آئین میں درج ہوتا ہے۔ پاکستان کا پہلا آئین ۱۹۵۶ء میں مرتب ہوا تو اس میں، قانون سازی کے سلسلہ میں، یہ شق درج تھی کہ ملک کا کوئی قانون "قرآن و سنت" کے خلاف نہیں ہوگا۔ جو آئین ۱۹۶۲ء میں مرتب ہوا اس میں یہ شق درج کی گئی کہ ملک کا کوئی قانون، اسلام، کے خلاف نہیں ہوگا۔ اس کے خلاف اعتراضات اٹھائے گئے تو اس شق کو یوں بدل دیا گیا کہ ملک کا کوئی قانون "قرآن و سنت" کے خلاف نہیں ہوگا۔ اس سے معترضین مطمئن ہو گئے۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا اس اصول کے تابع، کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب کیا جا سکتا ہے جسے یہاں کے تمام مسلمان، اسلامی قوانین تسلیم کر لیں؟

کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا

اس شق کی رو سے، کسی قانون کے اسلامی ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ (۱) قرآن کے خلاف نہ ہو۔ اور (۲) سنت کے خلاف نہ ہو — قرآن کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ یہ ایک متعین و معروف کتاب ہے۔

جس کا ایک ایک لفظ تمام مسلمانوں کے لئے مسلّم ہے۔ اس کی کسی سورت یا آیت کے متعلق تو ایک طرف اسکے کسی ایک لفظ کے متعلق بھی یہ سوال پیدا نہیں ہو سکتا کہ یہ قرآن میں ہے یا نہیں۔ یہ کتاب ایسی متفق علیہ اور مسلّم ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس شرط کے دوسرے جزو — سنّت — کی بھی یہی پوزیشن ہے؟ یہ وہ بنیادی سوال ہے جس پر اس سارے مسئلہ کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس لئے یہ بڑی ہی گہری توجہ کا محتاج ہے اس لئے بھی کہ (ایک خاص مصلحت کے ماتحت) یہ مشہور کر دیا گیا ہے کہ طلوع اسلام منکرِ سنت ہے۔ اس لئے سنت کی بحث کے سلسلہ میں اس کی کوئی بات درخورِ اعتنا نہیں ہونی چاہیئے۔ اس پراپیگنڈہ کا نتیجہ یہ ہے کہ جونہی طلوع اسلام نے قانون سازی کے متعلق کوئی بات کی' اسے یہ کہہ کر جھٹک دیا جاتا ہے کہ اس منکرِ حدیث اور منکرِ سنت کا کیا ہے؟ اسے اسلام سے کیا تعلق؟ ہماری آپ سے اتنی گزارش ہے کہ آپ اس سوال کو تھوڑے سے وقت کے لئے الگ رکھ دیں کہ طلوع اسلام منکرِ سنت ہے یا کچھ اور۔ آپ صرف یہ دیکھیں کہ جو کچھ آئندہ سطور میں کہا جا رہا ہے۔ وہ ٹھیک ہے یا نہیں؟ اگر وہ ٹھیک ہے تو اس کے بعد جس نتیجہ پر آپ کی فکر آپ کو پہنچائے' اسے صحیح تسلیم کر لیجئے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس پر آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ اب خود سے سنیئے کہ سنت کی پوزیشن کیا ہے؟

بحثِ سنّت

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے' قرآن کریم ایک متعین اور متعارف کتاب ہے لیکن دنیا میں کوئی ایسی کتاب نہیں جس کے متعلق کہا جا سکے کہ وہ سنتِ رسول اللہ کا مجموعہ ہے — کوئی کتاب ایسی نہیں — اہلحدیث حضرات کہتے ہیں کہ سنت اور حدیث مرادف الفاظ ہیں۔ یعنی حدیث ہی کو سنت کہا جاتا ہے۔ اس تعریف کی رو سے "قرآن و سنت" کے معنی ہوں گے' "قرآن اور حدیث"۔ لیکن دیگر حضرات' اس سے متفق نہیں۔ چنانچہ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اس باب میں (اپنی کتاب' رسائل و مسائل حصہ اول) میں لکھتے ہیں:۔

> سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبیؐ نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے، یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے ایک خاص دور میں پیدا ہوا تھا' اختیار کئے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کون سا جز سنت ہے اور کونسا جز عادت' بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے

مزاج کو سمجھ چکا ہو۔ تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں۔ کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانے کے حالات پر جن میں آپ مبعوث ہوئے تھے ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنت بنا دینا مقصود نہ تھا۔ (صفحہ ۳۱۱ تا صفحہ ۳۱۲)

اسی کتاب میں وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرز معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنت بنانا نہ تو مقصود تھا۔ نہ اس کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رُو سے اس طرز خاص کا لباس نبی پہنتے تھے۔ اور شرائع الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق، یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنت بنا دیں۔ سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاح شرعی میں سنت نہیں ہیں، ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے لینا منجملہ اُن بدعات کے ہے جن سے نظامِ دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔ (صفحہ ۳۱۴)

دونوں میں اختلاف

یعنی اہل حدیث حضرات کے نزدیک، ہر وہ بات جو احادیث کے صحیح مجموعوں میں درج ہے، سنت ہے۔ لیکن مودودی صاحب کے نزدیک ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ "سنت صرف اس طریق عمل کو کہیں گے جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا"۔ اس سے وہ تمام باتیں خارج ہیں جنہیں نبی اکرمؐ نے اپنی بشری حیثیت سے کیا تھا۔ اگر کوئی شخص ان باتوں کو بھی سنت قرار دے تو اس کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ:-

میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور خطرناک تحریف دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (ایضاً صفحہ ۳۰)

اس سے ذرا پہلے وہ لکھتے ہیں :-

> جو امور آپ نے عادۃً کئے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کر لیں، اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔ (صفحہ)

مودودی صاحب کی پیش کردہ، سنت کی اس تعریف (DEFINITION) کے متعلق مولانا محمد اسمٰعیل صاحب (صدر جمعیت اہلحدیث، مغربی پاکستان) لکھتے ہیں کہ

> میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات نہ صرف مسلک اہلحدیث کے خلاف ہیں، بلکہ یہ نظریات تمام ائمہ اہلحدیث کے خلاف ہیں۔ ان میں آج کے جدید اعتزال اور تجہم کے جراثیم مخفی ہیں۔
>
> (جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث۔ صفحہ ۱۱)

آپ نے غور فرمایا کہ خود سنت کی تعریف کے سلسلہ میں ان حضرات میں باہمی اختلافات کس قدر گہرے ہیں۔ مودودی صاحب، اہلحدیث حضرات کے مسلک کو "دین میں خطرناک تحریف" قرار دیتے ہیں۔ اور اہل حدیث حضرات کے نزدیک، مودودی صاحب کا مسلک، معتزلہ کا مسلک ہے۔

اگر اہل حدیث حضرات کے مسلک کو قبول کر لیا جائے تو اس سے کیا دشواریاں پیش آتی ہیں؟ اسکے متعلق ذرا آگے چل کر بات کی جائے گی۔ اس مقام پر یہ دیکھئے کہ اگر مودودی صاحب کے مسلک کو اختیار کیا جائے تو صورت کیا بنے گی؟

اس مسلک کی مشکلات

حدیث کی کسی کتاب میں یہ نہیں واضح کیا گیا کہ رسول اللہ نے فلاں بات رسالت کی حیثیت سے کی تھی اور فلاں بات بشری حیثیت سے۔ فلاں بات اپنے شخصی مذاق یا قومی طرزِ معاشرت کی رُو سے کی تھی، اور فلاں بات دینی حیثیت سے، حدیث کی کسی کتاب میں یہ تفریق و تمیز نہیں کی گئی۔ لہٰذا اس کے لئے پہلے یہ کرنا ہوگا کہ احادیث کے تمام مجموعوں سے، ان دونوں قسموں کے امور کو الگ الگ کیا جائے اور اس طرح سنتِ رسول اللہ کو متعین کیا جائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ یہ کام کون کرے۔ اور جو لوگ بھی اس فریضہ کو سرانجام دیں، اس کی کیا ضمانت ہے کہ دیگر حضرات ان کے نتائج سے متفق ہوں۔ اہل حدیث حضرات تو سرے سے اس تحریک ہی کے مخالف ہوں گے۔ سُنّی حضرات میں یہاں فقہ حنفی کے پیرؤں کی اکثریت ہے۔ (بلکہ حیثیت

لے ہم نے اس سلسلہ میں شیعہ حضرات کے متعلق بات نہیں چھیڑی۔ اس لئے کہ ان کے احادیث کے مجموعے الگ ہیں اور فقہ کے قوانین الگ۔ وہ سنت، حدیث، یا فقہ کے متعلق، سُنّی حضرات کے کسی فیصلہ کے متبع نہیں ہو سکتے۔

مجموعی یوں سمجھئے کہ یہ سب کے سب حنفی ہیں) ان کے ذمہ دار علماء میں سے کوئی بھی اس بات سے متفق نہیں ہوگا کہ مودودی صاحب یا ان کے ہم خیال حضرات، سنت کا جو مجموعہ اس طرح مرتب کریں، اسے مستقل شریعت کا درجہ دے دیا جائے۔ نہ ہی مودودی صاحب اس کے لئے آمادہ ہوں گے کہ کسی دوسرے کے اس طرح مرتب کردہ مجموعہ سنت کو وہ مستقل شریعت تسلیم کرلیں۔

یہاں تک بات یہ ہوئی ہے کہ ایک گروہ احادیث ہی کو سنت قرار دیتا ہے۔ اور دوسرے گروہ کا مسلک یہ ہے کہ احادیث سے سنت کو مرتب کیا جانا چاہیئے۔ لہٰذا، ان دونوں کے نزدیک 'حدیث' قدرِ مشترک ہے۔ (اگرچہ اس کے قانونِ شریعت بننے کے عملی انداز میں ان دونوں میں بنیادی فرق ہے) اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا "حدیث" کے متعلق یہ حضرات ایک دوسرے سے متفق ہیں؟

حدیث کے متعلق اختلاف

احادیث لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ ان میں سے چھ کتابیں ایسی ہیں جنہیں صحیح احادیث کے مجموعے سمجھا جاتا ہے۔ انہیں صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی)۔ ان میں سے بخاری اور مسلم کو صحیحین کہا جاتا ہے اور بخاری کو "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" کا درجہ دیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ سمجھا جاتے گا کہ احادیث کے ان مجموعوں میں جس قدر احادیث درج ہیں، وہ (شیعہ حضرات کو چھوڑ کر باقی) مسلمانوں کے نزدیک صحیح احادیث ہیں۔ لیکن حقیقت یہ نہیں۔ اہل حدیث کا اس باب میں مسلک یہ ہے کہ

> بخاری اور مسلم کی صحت پر اُمت متفق ہے .. .. .. ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔　　(جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث۔ صفحہ ۱۰)

قطعی صحت کے معنے یہ ہیں کہ :-

> تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے۔ اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان و دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا .. .. جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں، ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مرادف۔
>
> (ایضاً صفحہ ۵)

یعنی ان حضرات کے عقیدہ کی رُو سے بخاری یا مسلم کی کسی ایک حدیث سے انکار کفر ہے اور دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مرادف۔ اس کے برعکس مودودی صاحب کا مسلک یہ ہے کہ

یہ دعوے کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا
توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۲ء)

اس ایک نکتہ کی رُو سے بھی دیکھئے، تو مودودی صاحب اور ان کے ہمنوا حضرات، اہل حدیث حضرات کے عقیدہ کے مطابق، کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار پاجاتے ہیں۔ جماعت اہل حدیث کا عقیدہ یہ ہے کہ:

جبریل، قرآن اور سنت دونوں کو لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضرتؐ کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔

(جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث صفحہ)

اس کے برعکس مودودی صاحب کا مسلک یہ ہے کہ:

قولِ رسولؐ اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں، لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیاتِ قرآن کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیاتِ قرآن کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجائش ہی نہیں بخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجائش ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے، وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔

(رسائل و مسائل۔ جلد اول صفحہ)

حدیث کی تاریخ

جو حضرات علم حدیث اور اس کی تاریخ سے واقف نہیں، ان کی اطلاع کے لئے یہ بیان کردینا ضروری ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے امت کو نہیں دیا تھا۔ نہ ہی خلفائے راشدینؓ یا دیگر صحابہ کبارؓ نے کوئی ایسا مجموعہ مرتب کیا۔ جسے احادیث کا صحیح ترین مجموعہ (یعنی بخاری) کہا جاتا ہے، وہ رسول اللہ کی وفات کے قریب اڑھائی سو سال بعد انفرادی طور پر مرتب ہوا۔ وہ بھی کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کی رُو سے نہیں، بلکہ اس طرح کہ امام بخاریؒ سے ایک شخص نے آکر رسول اللہ کی کوئی بات سنت بیان کی۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ تمہیں اس کا کیسے علم ہوا۔ اس نے کہا کہ میں نے اسے فلاں شخص سے سُنا تھا جو اب فوت ہوچکا ہے۔ اس نے فلاں سے، اس نے فلاں سے۔۔۔ اور اس طرح آخری آدمی نے رسول اللہ سے سُنا تھا۔ ان راویوں کو اس حدیث کی سند کہا جاتا ہے۔ اور اس سلسلہ کو سلسلۂ استناد۔ جس حدیث کو صحیح کہا جاتا ہے اس کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ اس کے بیان کرنے والے راویوں کے متعلق، بعد میں (یعنی ان کی وفات کے سینکڑوں برس بعد) یہ

تحقیق کر لیا گیا تھا کہ وہ بڑے قابلِ اعتماد لوگ تھے۔ لہٰذا جس بات کو رسول اللہؐ کی حدیث کہا جاتا ہے وہ درحقیقت "قول منسوب الی الرسول" ہوتی ہے۔ یعنی ایسی بات جسے رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ:

> اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہؐ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریقِ مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (رسائل و مسائل۔ صفحہ ۲۵۰)

یعنی جس بنیاد کی رو سے آج تک احادیث کو صحیح یا غلط قرار دیا جاتا تھا مودودی صاحب سرے سے اس بنیاد ہی کو غلط قرار دیتے ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ:

> مثال کے طور پر آج میں ایک تقریر کرتا ہوں اور کئی ہزار آدمی اس کو سنتے ہیں۔ جلسہ ختم ہونے کے چند گھنٹے بعد ہی (مہینوں اور برسوں کے بعد نہیں بلکہ چند گھنٹے بعد ہی) لوگوں سے پوچھ لیجئے کہ مقرر نے کیا کہا؟ آپ دیکھیں گے کہ تقریر کا مضمون نقل کرنے میں سب کا بیان یکساں نہ ہوگا۔ کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کرے گا کوئی کسی ٹکڑے کو۔ کوئی کسی جملے کو لفظ بلفظ نقل کرے گا، کوئی اس مفہوم کو جو اس کی سمجھ میں آیا ہے اپنے الفاظ میں بیان کر دے گا۔ کوئی زیادہ فہیم آدمی ہوگا اور تقریر کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس کا صحیح ملخص بیان کرے گا۔ کسی کی سمجھ زیادہ اچھی نہ ہوگی اور وہ مطلب کو اپنے الفاظ میں اچھی طرح ادا نہ کر سکے گا۔ کسی کا حافظہ اچھا ہوگا اور وہ تقریر کے اکثر حصے لفظ بہ لفظ نقل کر دے گا۔ کسی کی یاد اچھی نہ ہوگی وہ نقل و روایت میں غلطیاں کرے گا۔
>
> (تفہیمات حصہ اول۔ صفحہ ۳۱۹-۳۲۰)

اس سے واضح ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک ـــــ

(۱) حدیث کی کوئی کتاب بھی ایسی نہیں جس کی ہر حدیث کو صحیح تسلیم کر لیا جائے۔

(۲) احادیث کو پرکھنے کا جو اصول ائمہ حدیث نے بیان اور اختیار کیا تھا، اور جس کی رو سے انہوں نے احادیث کی جانچ پڑتال کر کے صحیح احادیث کو غلط سے الگ کر لیا تھا، وہ اصول ہی صحیح نہیں۔

لہٰذا ـــــ

احادیث کا صحیح مجموعہ نئے سرے سے مرتب کیا جائے

(۳) احادیث کے تمام مجموعوں کی از سر نو جانچ پڑتال کر کے، صحیح احادیث کو ضعیف احادیث سے الگ کیا جائے گا۔

اس سے یہ اہم سوال سامنے آیا کہ ایسا کون کرے گا۔ اور اس کے پاس وہ کون سا معیار ہوگا جس کی رو سے وہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نکھار کر الگ کر دے گا۔ اس کے متعلق مودودی صاحب جو کچھ فرماتے ہیں وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایسا وہی شخص کر سکتا ہے ــــ

مزاج شناس رسولؐ

جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ کا مزاج شناس ہو جاتا ہے..... اسکی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے...... اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد وہ اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر انتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت کو دیکھ سکتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جامِ زریں میں جو بادہ معنی بھری ہوتی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبویؐ کے مناسب نظر نہیں آتی۔

(تفہیمات۔ حصہ اول۔ صـ۳۲۲ تا ۳۲۴)

مودودی صاحب کی اس "مزاج شناسیٔ رسولؐ" کے متعلق، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کا ارشاد ہے کہ:۔

اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسولؐ کا مزاج شناس تصور کرے۔ پھر اسے اختیار دے دے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کر لے اور جسے چاہے رد کر دے۔ یا کوئی عالم یا قائد بلا وجہ کسی موضوع یا مختلق، مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعوے کر دے کہ میں نے اس میں "ہیرے کی جوت" دیکھ لی ہے تو یہ مضحکہ خیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے ــــ ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنتِ رسولؐ کو ان ہوائی حملوں سے

بچانے کی کوشش کریں گے۔ (جماعتِ اسلامی کا نظریہ حدیث ص۲۳)

ملخص جو کچھ اس وقت تک لکھا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ :-

(۱) آئینِ پاکستان (۱۹۶۲ء) کی رو سے ملک میں کوئی قانون ایسا نافذ نہیں ہوگا جو "کتاب و سنت" کے خلاف ہو۔

(۲) اس وقت دنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہو کہ وہ سنتِ رسول اللہ کا متفق علیہ مجموعہ ہے۔

(۳) ابھی تک یہ بھی متفقہ طور پر طے نہیں پا سکا کہ "سنت" کی تعریف کیا ہے۔

(۴) مودودی صاحب کا مسلک یہ ہے کہ سنت کو احادیث کے مجموعوں سے چن کر مرتب کیا جائے گا۔ (اہل حدیث حضرات ایسا کہنے والے کو کافر قرار دیتے ہیں)

(۵) لیکن ان کے نزدیک، احادیث کا بھی کوئی ایسا مجموعہ نہیں جس کی ہر حدیث کو صحیح تسلیم کر لیا جائے احادیث کے مجموعوں کی از سر نو جانچ پڑتال کر کے "صحیح احادیث" کا مجموعہ مرتب کرنا ہوگا۔

(۶) اس جانچ پڑتال کے لئے کوئی اصول نہیں ہوگا۔ اس کا کلیتہً دارومدار "مزاج شناس رسول" کی نگہ جوہر شناس پر ہوگا۔ جسے وہ صحیح کہدے اسے صحیح تسلیم کرنا ہوگا۔ جسے وہ مسترد قرار دیدے اسے رد کر دینا پڑے گا۔

(اور آپ کو غالباً یاد ہوگا کہ "منیر انکوائری کمیٹی" کے روبرو، جماعتِ اسلامی کے ذمہ دار حضرات نے اس کا اعتراف کیا تھا کہ ان کے نزدیک یہ "مزاج شناسِ رسولؐ" خود مودودی صاحب ہیں)

(۷) مزاج شناس رسولؐ، اس طرح سنت کا مجموعہ مرتب کرنے میں مصروف ہوگا۔ اور اہلحدیث حضرات (بلکہ ان کے ساتھ حنفی حضرات بھی) سنتِ رسولؐ کو اس کے ان "ہوائی حملوں" سے بچانے کی کوشش میں مشغولِ جہاد!

ایسا ہونا ناممکن ہے ان تصریحات کی روشنی میں آپ خود فرمائیے کہ کیا یہ کسی طرح ممکن بھی ہے کہ پاکستان میں کوئی ایسا متفق علیہ مجموعہ قوانین مرتب ہو سکے جو "کتاب و سنت" سے مطابقت کی شرط کو پورا کر سکے؟ اور کیا آپ ایسا باور کرنے کے لئے تیار ہیں کہ (اور لوگوں کو تو چھوڑیئے) مودودی صاحب اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ایسا ہونا ناممکن ہے! وہ اس سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ اسی لئے وہ اس شرط پر اصرار کئے جاتے ہیں۔ اس کی تہ میں راز یہ ہے کہ اس سے انہیں برسرِ اقتدار پارٹی کے

خلاف پراپیگنڈہ کرنے کے لئے یہ مستقل (LEVER) مل جاتا ہے کہ دیکھئے! یہ لوگ یہاں اسلامی قوانین نافذ نہیں کرتے۔ اس لئے اقتدار ان کے ہاتھ سے چھین لینا چاہیئے۔ اگر مودودی صاحب اپنے اس مطالبہ میں صادق ہوتے تو ان کے لئے کرنے کا کام یہ تھا کہ وہ مختلف مکاتیب فکر کے علماء کو ساتھ لے کر ایک ایسا مجموعۂ قوانین مرتب کرتے جو یہاں کے بسنے والے تمام مسلمانوں کے نزدیک کتاب وسنت سے مطابقت کی شرط پر پورا اُترتا اور اس کے ساتھ ہی بدلتے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتا۔ اگر کوئی برسر اقتدار پارٹی اس کی مخالفت کرتی تو پھر انہیں اس کا حق حاصل تھا کہ خدا اور رسولؐ کے نام پر اس پارٹی کی مخالفت کرتے لیکن وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے اس لئے وہ اس قسم کا قدم اٹھا کر اپنے کھیل کو کیوں بگاڑ لیں وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ جب "کتاب وسنت" کی مطابقت کی شرط کی رُو سے دنیا بھر کے مسلمان، ہزار برس میں، نماز کی کوئی متفق علیہ شکل متعین نہیں کر سکے تو وہ ایسا ضابطہ قوانین کس طرح مدون کر لیں گے جو زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہو؟ لہٰذا کامیابی اسی میں ہے کہ اس ناممکن العمل شرط پر زور دیئے جائیں اور اپنا پراپیگنڈہ جاری رکھیں۔

بہرحال آپ نے یہ دیکھ لیا کہ ملک میں کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب ہو ہی نہیں سکتا جو یہاں کے بسنے والے تمام مسلمانوں کے نزدیک "کتاب وسنت" کی مطابقت کی شرط پر پورا اُتر سکے۔ اور ظاہر ہے کہ جب ایسا ضابطہ قوانین ہی نہیں بن سکتا تو پھر

پاکستان اسلامی مملکت کس طرح بن سکتا ہے؟

امکانی صورت کیا ہے؟

اس مقام پر آپ یقیناً یہ کہیں گے کہ یہ تو یکسر نا امیدی کی صورت ہے اور تم نے شروع میں کہا تھا کہ اس میں نا امیدی کی کوئی بات نہیں۔ تو پھر امید کی صورت کیا ہے؟

اس میں امید کی صورت ہی نہیں بلکہ یقینی بات ہے کہ یہاں اسلامی قوانین مرتب ہو سکتے ہیں، اور اس طرح پاکستان اسلامی مملکت بن سکتا ہے۔ اس کے لئے ہمیں قرآن کریم کی طرف رجوع کرنا پڑیگا۔

آپ قرآن کریم پر غور کیجئے۔ اس میں (معاشرتی زندگی سے متعلق چند قوانین کے علاوہ) زندگی کے تمام معاملات کے متعلق صرف اصولی راہنمائی دی گئی ہے۔ ان کے جزئی احکام متعین کر کے نہیں دے دیئے گئے۔ جس کتاب کو، قیامت تک کے انسانوں کے لئے ضابطۂ ہدایت بننا تھا۔ اس کا انداز ہونا ہی ایسا چاہیئے تھا۔ انسانی زندگی کے تقاضے عہد بہ عہد بدلتے رہتے ہیں۔ ان بدلنے والے تقاضوں سے متعلق جزئی

احکام اس طرح متعین ہی نہیں کئے جاسکتے کہ ہر زمانے کے انسانوں کے لئے ان کی پابندی ممکن ہو۔ ذرا سوچئے کہ اگر وہ قوانین جو جاری زمانے کے تقاضوں کو پورا کر سکیں، آج سے چودہ سو برس پہلے کے عربوں کو دیئے جاتے، تو ان پر عمل کرنا تو ایک طرف، وہ انہیں سمجھ بھی نہ سکتے۔ (مثلاً) ان سے اگر کہا جاتا کہ انشورنس کے متعلق قانون یہ ہے اور بنکنگ کے متعلق یہ، تو وہ جب انشورنس اور بنکنگ کے سسٹم ہی سے ناآشنا تھے اور یہ سسٹم اس زمانے میں اس طرح موجود ہی نہ تھا تو ان کے لئے یہ قوانین بے معنی ہوتے۔ اس کے برعکس، جو قوانین صرف اس زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے دیئے گئے تھے اگر انہیں ابدی طور پر مستقل اور غیر متبدل قرار دے دیا جاتا تو زندگی ایک خاص ماحول میں جکڑ کر رہ جاتی اور بعد والوں کے لئے ان پر عمل کرنا مشکل ہو جاتا۔ اس کے لئے یا تو یہ صورت ممکن تھی کہ ہر دور میں ایک نیا رسول آتا جو اپنے دور کے انسانوں کے لئے نئے قوانین دیتا (جیسا کہ نبی اکرمؐ سے پہلے ہوتا چلا آیا تھا) لیکن ختم نبوت نے اس شکل کو بھی ختم کر دیا۔ اب دوسری صورت یہی تھی کہ جزئی قوانین دینے کے بجائے، ایسے اصولِ حیات دے دیئے جاتے جن کے تابع انسانی زندگی کو رکھنا مقصود تھا۔ اور ہر زمانے کے انسانوں کو اس کی آزادی ہوتی

ثبات و تغیر کا امتزاج

کہ وہ، ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے، باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں۔ یہ اصول ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہتے، اور ان کے اندر مرتب کردہ جزئی قوانین زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے جاتے۔ قرآن کریم نے یہی انداز اختیار کیا۔ علامہ اقبالؒ کہ جنہوں نے پاکستان کا تصور دیا تھا تاکہ یہ مملکت اسلامی بن سکے، اس باب میں لکھتے ہیں:-

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس ازلی وابدی ہے لیکن اس کی نمو تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و نسق کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں ...... لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے کے اندر تغیر کا امکان ہی نہیں تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر

رہ گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ (خطبات، تشکیلِ جدید)

قرآن کریم کے ان غیر متبدل اصولوں کی جزئیات سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق مرتب فرمائیں۔ ان جزئیات کا ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھا جانا، نہ مقصودِ دین تھا نہ منشاءِ رسالت۔ یہ وجہ تھی کہ حضورؐ نے ان جزئیات کو مدون کر کے ان کا مجموعہ امت کو نہ دیا۔ اور نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے ایسا کیا۔ اس کے برعکس، ہمیں تاریخ میں متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں، جن میں خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں، ان جزئیات میں ردو بدل کیا گیا۔ (طلوعِ اسلام اس باب میں اس سے پہلے اسقدر تفصیل سے لکھ چکا ہے کہ اس مقام پر اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ جو حضرات ان تفاصیل کا مطالعہ کرنا چاہیں وہ ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "سلیم کے نام خطوط" (حصہ دوم) کے متعلقہ خطوط مطالعہ فرمائیں) علامہ اقبالؒ اس باب میں لکھتے ہیں:۔

> احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے علی حالہ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جاسکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا ہے۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علی حالہ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کرے۔ لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جاسکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے مسلکِ زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے

رکھتے ہیں۔ لیکن اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرنا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رُو سے رسول کے احکام اُس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں، اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنے فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث سے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے ... ... ان حالات کی روشنی میں میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابو حنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

(خطبات اقبال صفحہ ۱۷۲-۱۷۳)

شاہ ولی اللہ کا مسلک

علامہ اقبالؒ نے اس باب میں، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ہمارے زمانے میں مسلک ولی اللّٰہی کے سب سے بڑے شارح اور مبلغ (مولانا) عبید اللہ سندھی مرحوم تھے۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:۔

واضح رہے کہ جب اساسی قانون پر عملدرآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ قانون اساسی غیر متبدل ہوتا ہے اور تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم سنت ان تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں جو رسول اللہ اور آپ کے بعد خلفائے ثلاثہ رضؓ نے مسلمانوں کی مرکزی جماعت کے مشورہ سے تجویز کئے تھے ... ... سنت کو ہمارے فقہائے حنفیہ رسول اللہؐ اور خلفائے راشدین میں مشترک مانتے ہیں اور یہی ہماری رائے ہے اور یہ سنت قرآن ہی سے پیدا ہوگی۔ آجکل کی اصطلاح میں اس کو بائیلاز کہا جاتا ہے۔ اصل قانون اساسی متعین ہے۔ بائیلاز اُس وقت اور تھے، اِس وقت اور ہوں گے جن میں زمانے کے اقتضاآت کے مطابق فروعی تبدیلیاں ہوں گی۔ نئی نئی پیش آمدہ

صورتوں کے متعلق تفصیلی احکام کا استخراج ہوگا۔ اور اس کا نام فقہ ہے۔[1] (رسالہ الفرقان، ولی اللہ نمبر ۱۳۵۹ھ)

مودودی صاحب اسکی تائید کرتے ہیں اور آپ کو یہ معلوم کر کے شاید تعجب ہوگا کہ مودودی صاحب بھی اس مسلک کی تائید کرتے ہیں۔ وہ تفہیمات (جلد اول) میں لکھتے ہیں:۔

دین کے اصول سب کے سب کتاب اللہ میں موجود ہیں جو روایات سے بالاتر اور سب مسلمانوں میں مشترک ہیں۔ (ص ۳۲۹)

وہ رسائل و مسائل (جلد اول) میں لکھتے ہیں۔

یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جن چیزوں پر کفر و اسلام کا مدار ہے اور جن امور پر انسان کی نجات موقوف ہے انہیں بیان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے۔ وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں اور قرآن میں بھی ان کو کچھ اشارۃً یا کنایۃً بیان نہیں کیا گیا بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ ان علینا للھدیٰ۔ (ص ۷۶)

وہ اپنی تفسیر تفہیم القرآن (ص ۵۹۹) میں لکھتے ہیں:۔

حرام اور حلال ... جائز اور ناجائز کی حدود مقرر کرنا، اور انسانی زندگی کے لئے قانون اور شرع تجویز کرنا یہ سب خدا ہی کے مخصوص اختیارات ہیں جنہیں سے کسی کو غیر اللہ کے لئے تسلیم کرنا شرک ہے۔

اس حقیقت کی تشریح کرتے ہوئے وہ تفہیمات (حصہ دوم) ص ۳۲۹ میں لکھتے ہیں:۔

اسی اصل کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جو ابو داؤد نے سلمان فارسیؓ سے ان الفاظ نقل کی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام ما حرم اللہ فی کتابہ۔ وما سکت عنہ فھو مما عفا عنہ۔ حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا۔ رہی وہ چیزیں جنکا ذکر نہیں کیا گیا تو وہ معاف ہیں۔

وہ اس سوال کا جواب کہ اللہ تعالیٰ نے دین کی جزئیات بھی خود ہی متعین کیوں نہیں کر دیں، اپنی تفسیر تفہیم القرآن (جلد اول) کے صفحات ۵۰۶-۵۰۷ پر ان الفاظ میں دیتے ہیں:۔

ایک دوسری حدیث میں ہے۔ ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحرم حرمات فلا تنتھکوھا وحد حدودا فلا تعتدوھا وسکت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض تم پر عاید کئے ہیں انہیں ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے ان کے پاس نہ پھٹکو، کچھ حدود

---

[1] جو حضرات اس باب میں مزید تفاصیل معلوم کرنا چاہیں وہ ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقام حدیث" (جدید ایڈیشن) کا مطالعہ فرمالیں۔ یہ اقتباس بھی وہیں سے لیا گیا ہے۔

مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے۔ بغیر اس کے کہ اسے بھول لاحق ہوئی۔ لہذا ان کی کھوج نہ لگاؤ۔

ان دونوں حدیثوں میں ایک اہم حقیقت پر متنبہ کیا گیا ہے۔ جن امور کو شارع نے مجملاً بیان کیا ہے اور ان کی تفاصیل نہیں بتائیں یا جو احکام بر سبیلِ اجمال دیئے ہیں اور مقدار یا تعداد یا دوسرے تعینات کا ذکر نہیں کیا ہے ان میں اجمال اور عدم تفصیل کی وجہ یہ نہیں ہے کہ شارع سے بھول ہو گئی۔ تفصیلات بتانی چاہئیں تھیں مگر نہ بتائیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شارع ان امور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا اور احکام میں لوگوں کے لئے وسعت رکھنا چاہتا ہے۔ اب جو شخص خواہ مخواہ سوال پر سوال نکال کر تفصیلات اور تعینات اور تقییدات بڑھانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر شارع کے کلام سے یہ چیزیں کسی طرح نہیں نکلتیں تو قیاس سے استنباط سے کسی نہ کسی طرح مجمل کو مفصل مطلق کو مقید غیر معین کو معین بنا کر ہی چھوڑتا ہے۔ وہ درحقیقت مسلمانوں کو بڑے خطرے میں ڈالتا ہے (یہودیوں نے ایسا ہی کیا) جن کے نقشِ قدم پر چلنے میں قرآن اور محمد صلعم کی تنبیہات کے باوجود مسلمانوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔

(جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) قرآن کریم میں بیان کردہ اصولی احکام کی جزئیات، سب سے پہلے عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں متعین ہوئیں۔ کیا یہ جزئیات ابدالآباد تک جوں کی توں رہیں گی یا ان میں حسبِ اقتضائے حالات تغیر و تبدل کیا جا سکے گا۔ اس کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجے کے علم سے کام لیکر اپنے احکام کی بجاآوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اسکے مقاصد کو پورا کرتی ہیں لیکن اسکے باوجود بکثرت جزئیات ایسی بھی ہیں جن میں تغیرِ حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے، لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں۔ لہذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں، ان کو ہوبہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح احکام کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں ...... پس معلوم ہوا کہ جزئیات میں دلالۃ النص اور اشارۃ النص تو درکنار صریح النص کی پیروی بھی تفقہ کے بغیر درست نہیں ہوتی اور تفقہ کا اقتضاء یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ میں شارع کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھے اور انہی کے لحاظ سے جزئیات میں تغیرِ احوال کیساتھ ایسا تغیر کرتا رہے جو شارع کے اصولِ تشریع پر مبنی اور اسکے طرزِ عمل سے اقرب ہو۔ (تفہیمات حصہ دوم صفحہ ۳۲۷)

ہم نماز کیسے پڑھیں

آپ نے دیکھا کہ مودودی صاحب خود اس اصول سے متفق ہیں کہ جن احکام کو قرآن کریم نے مجمل طور پر بیان کیا ہے، اسکا مطلب یہ ہے کہ اسکی تفاصیل زمانے کے تقاضے کے ساتھ بدلتی رہینگی۔ اس اصول کے ماتحت پاکستان میں اسلامی قوانین آسانی سے مرتب ہو سکتے تھے۔ لیکن جب (جیسا کہ ہم ذرا آگے چلکر بیان کرینگے) یہی اصول صدر ایوب نے پیش کیا تو یہی مودودی صاحب اسکی مخالفت میں سب سے آگے بڑھ آئے اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو اسکے یہ معنی ہوں گے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے سب طریقے بدل جائیں گے کیونکہ ان کی تفاصیل تو قرآن میں نہیں ہیں۔ یہ تفاصیل تو احادیث سے ملتی ہیں۔ لہٰذا جو تفاصیل احادیث میں ملتی ہیں وہ بھی سب کی سب غیر متبدل ہیں۔ البتہ یہ مسئلہ کہ ان میں کون کونسی بات صحیح ہے اور کونسی غلط، اسکا فیصلہ مزاج شناس رسولؐ ہی کرے گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ صاحب کس طرح پھر پھرا کر اسی ایک نقطہ پر آجاتے ہیں کہ قانون سازی کے آخری اختیارات مزاج شناس رسولؐ کو حاصل ہونے چاہئیں۔

بہر حال، یہ ہے وہ طریق جس کے مطابق پاکستان میں اسلامی قوانین مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ یعنی جو کچھ قرآن کریم میں دیا گیا ہے وہ غیر متبدل ہے اور زندگی کے جن معاملات میں اس نے اصولی راہنمائی دی ہے، انکے تفصیلی احکام ہم

اعتراضات کا جواب

اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے، خود مرتب کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں دو ایک اعتراضات پیش کر دیئے جاتے ہیں جنکا جائزہ لینا ضروری ہے۔ مثلاً :-

(۱) یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن کے اصولوں میں بھی تو تعبیر (INTERPRETATION) کا اختلاف ہو سکتا ہے، لہٰذا اس سے بھی متفق علیہ قوانین کس طرح مرتب ہو سکیں گے؟

ہم نے دیکھا یہ ہے کہ یہ اعتراض اکثر ان لوگوں کی طرف سے کیا جاتا ہے جنہوں نے قرآن کریم کا خود بغائر مطالعہ نہیں کیا۔ وہ محض سنی سنائی باتوں سے ایسا کہہ دیتے ہیں۔ قرآن کا انداز بیان ایسا صاف، سیدھا اور واضح ہے کہ اسکے سمجھنے میں کسی قسم کا ابہام نہیں ہوتا۔ مودودی صاحب کے الفاظ میں :-

> قرآن کریم اپنے مدعا کو بغیر کسی ابہام کے صاف صاف بیان کرتا ہے اور اس نے کسی ایسی حقیقت کو جسکا جاننا آدمی کے لئے ضروری تھا، واضح کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔ (ترجمان القرآن بابت اپریل مئی ۱۹۵۵ء)

قرآن کی تعبیر کے اختلاف کے سلسلہ میں یہ لوگ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے اختلافات کو بطور دلیل پیش کر دیتے ہیں۔ انہیں اسکا علم نہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا اختلاف روایات کے اختلاف کا نتیجہ ہے، قرآن کی تعبیر میں اختلاف کا نتیجہ نہیں۔ ہمارے مختلف فرقوں کے عقائد، عبادات، مناسک، فقہی قوانین، سب کی بنیاد روایات میں۔ حتیٰ کہ ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ حدیث، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے (ملاحظہ فرمائیے حافظ محمد ایوب صاحب

کا کتابچہ "فتنۂ انکار حدیث") اور صرف حدیث ہی نہیں' ائمہ فقہ کے اقوال بھی قرآن کو منسوخ کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں فقہ حنفی کے امام' ابوالحسن عبید اللہ الکرخی' کا ارشاد ہے کہ۔

ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں' وہ یا تو ماؤل ہے اور یا منسوخ۔

(تاریخ فقہ اسلامی۔ علامہ الخضری صفحہ ۲۲۴)

اسلئے ہمارے مختلف فرقوں کے اختلافات کا سبب روایات اور فقہ کے اختلافات ہیں' قرآن کریم نہیں۔

فرقہ اہل قرآن بعض لوگوں کو یہ بھی کہتے سنا گیا ہے کہ فرقہ اہل قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ قرآنِ خالص سے احکام متعین کرتے ہیں لیکن ان میں بھی باہمی اختلاف ہے۔ ایسا کہنے والوں کو دراصل اس کا علم نہیں کہ فرقۂ اہل قرآن نے کون سی باتیں قرآن سے متعین کرنے کی کوشش کی اور ان میں باہمی اختلاف ہوا؟ قرآن نے جن امور کو اصولی طور پر بیان کیا ہے' یہ فرقہ ان کی جزئیات کو بھی قرآن سے متعین کرنے لگ گیا۔ اب ظاہر ہے کہ جو باتیں قرآن میں ہوں ہی نہ' اگر کوئی انہیں بھی قرآن سے متعین کرنے بیٹھ جائے تو ان میں اختلاف نہیں ہوگا' تو اور کیا ہوگا؟ جو لوگ یہ بھی قرآن سے متعین کرنا چاہیں کہ نماز میں ہاتھ کہاں باندھنے چاہئیں ان میں اختلاف کے سوا اور کیا ہوگا؟ فرقہ اہل قرآن کی یہی بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے وہ خود ناکام رہا اور اس کی وجہ سے قرآن بدنام ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ ان حضرات کے نزدیک' اسلام کی حیثیت بھی (عام تصور کے مطابق) مذہب کی تھی' نظامِ مملکت کی نہیں تھی۔ اس فرقہ کے بانی (مولانا) عبید اللہ چکڑالوی مرحوم کے ہاں "نظام" کا لفظ تک نہیں ملتا۔ اسلئے یہ حضرات انفرادی طور پر قرآنی فقہ مرتب کرنے لگ گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری امت کے لئے ایک متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب کرنا تو ایک طرف' یہ آپس میں بھی اتنا طے نہ کر سکے کہ نماز کتنے وقتوں کی فرض ہے۔ قرآن نے زندگی کے جو اصول و احکام دیئے ہیں وہ صاف اور واضح ہیں' جن جزئیات سے وہ خاموش رہا ہے انکے متعلق اس کی تعلیم یہ ہے کہ انہیں امت باہمی مشورے سے مرتب کرے۔ اس طریق کو اختیار کیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس باب میں کوئی اختلاف پیدا ہوتا ہے؟ اس دعویٰ کا زندہ ثبوت خود عہد رسالت مآبؐ اور دور خلافتِ راشدہ ہے جس میں اس طریق کو اختیار کیا گیا اور امت میں کوئی اختلاف (یا فرقہ) پیدا نہ ہوا۔

اور اگر یہ واقعہ بھی ہو کہ فرقہ اہل قرآن' یا کسی اور کو قرآن کریم کے کسی حکم کے سمجھنے میں غلطی لگ گئی ہے تو کیا اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ قرآنی احکام کا صحیح مفہوم متعین ہی نہیں کیا جا سکتا اور اس میں اختلافی باتیں بھی موجود ہیں؟ ایسا سمجھنے سے تو نہ قرآن کی کوئی حیثیت باقی رہتی ہے نہ اس پر ہمارا ایمان — اسنے تو اپنے من جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ

افلا یتدبرون القرآن۔ ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیرا۔ (۴/۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں

یہ لوگ بہت سے اختلاف پاتے۔

لہذا، قرآن فہمی میں اختلاف، غور و تدبر سے رفع ہو سکتا ہے۔ پھر اسے بھی سمجھ لیجئے کہ جو سوال ہمارے زیر نظر ہے، وہ قرآنی اصولوں کی روشنی میں، جزئی احکام کی تدوین ہے۔ اور یہ کام انفرادی طور پر کرنے کا نہیں۔ یہ قرآن کریم اور حالات حاضرہ پر غائر نگاہ رکھنے والے نمائندگانِ امت کا اجتماعی فریضہ ہوگا۔ قانون سازی کا یہی طریق عہد رسالتمآب اور خلافتِ راشدہ میں تھا۔ اسی کو اب اختیار کرنا چاہیئے۔ آپ نے غور نہیں فرمایا کہ قرآن کریم میں خود نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ (۳/۱۵۸) امور مملکت میں لوگوں سے مشورہ کیا کرو۔

خدا اور رسولؐ کی اطاعت

پھر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ قرآن میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت کا حکم ہے۔ اس طرح کی قانون سازی میں اطاعتِ رسولؐ کس طرح کی جا سکے گی؟

سوال یہ ہے کہ جس طرح اس وقت اطاعتِ رسولؐ کی جاتی ہے کیا اس کے متعلق کوئی فرد یا کوئی فرقہ حتمی اور یقینی طور پر ثابت کر سکتا ہے کہ وہ فی الواقع اطاعتِ رسولؐ کر رہا ہے؟ مثلاً نماز کو لیجئے۔ اس کے ادا کرنے میں ہر فرقے میں اختلاف ہے۔ اور ہر فرقہ یہ کہتا ہے کہ اس کا طریقِ نماز رسول اللہ کے طریقے کے عین مطابق ہے۔ کیا آپ باور کر سکتے ہیں کہ ہر فرقہ کا یہ دعویٰ صحیح ہے۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔ لہذا اس وقت اطاعتِ رسولؐ کا عملی مفہوم اس سے زیادہ اور کیا ہے کہ جس طریق پر کوئی چل رہا ہے اس سے اس نے اپنے آپ کو اطمینان دے رکھا ہے کہ وہ اطاعتِ رسول کر رہا ہے۔ یہ وہی ذہنیت ہے جو

فرقہ بندی شرک ہے

فرقہ بندی کا فطری نتیجہ ہے۔ اور جسے قرآن نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے۔ کہ

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ۔ (۳۰/۳۱-۳۲) — مسلمانو! دیکھنا، تم کہیں اسلام لانے کے بعد مشرک نہ ہو جانا یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے پھر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ جس طریق پر میں چل رہا ہوں وہ حق کا طریق ہے۔

آپ اس آیت جلیلہ پر سے یونہی سرسری طور پر نہ گذر جایئے۔ یہ ایک عظیم حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ:۔

(۱) مسلمانوں میں فرقوں کا وجود شرک ہے۔

(۲) فرقہ بندی سے کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ بجائے اس کے کہ فرقہ پرستانہ عصبیت سے الگ ہو کر یہ سوچا جائے کہ حق کی راہ کون سی ہے ہر فرقہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دلا لیتا ہے کہ ہم حق پر ہیں۔ اطاعتِ خدا و

رسول اسی طریق سے وابستہ ہے جسے ہم نے اختیار کر رکھا ہے۔

کیا اس قسم کی خود اطمینانی کو اطاعتِ رسول کہا جا سکتا ہے؟

قرآنِ کریم کی رُو سے "اطاعتِ خدا و رسولؐ" کا مفہوم کیا ہے؟ اسکے متعلق ہم بارہا بار، شرح و بسط سے، لکھ چکے ہیں۔[ئے] اس وقت صرف اتنا دہرا دینا کافی ہے کہ اس سے مفہوم ہے اس نظامِ حکومت کی اطاعت جو خدا کے احکام کو نافذ کرنے کے لئے قائم کی جائے۔ اس نظام کو سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا۔ اور اس کے بعد حضورؐ کے سچے جانشینوں نے اسے جاری رکھا۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد، اس نظامِ حکومت کی اطاعت جسے خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا جاتا ہے، "خدا و رسول کی اطاعت" تھی۔ جب تک یہ سلسلہ قائم رہا، خدا و رسولؐ کی اطاعت ہوتی رہی۔ اس کے بعد، خدا اور رسول کی اطاعت سے مفہوم اُس فرقہ کے مسلک کی اطاعت رہ گیا جس سے کوئی شخص منسلک ہوگیا۔ اس طریق کی رُو سے اطاعتِ رسول کے مدعیوں کے متعلق قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ رسول کو ان سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔

ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعًا - لست منھم فی شیءٍ - (۶/۱۵۹)

جو لوگ دین میں فرقے پیدا کرلیں اور خود ایک گروہ بن بیٹھیں، (اے رسولؐ!) تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

یاد رکھیئے۔ "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" کا صحیح طریق وہی ہے جو خلافت علیٰ منہاج نبوت میں رائج تھا۔ یعنے ایک امت جس میں کوئی فرقہ نہ ہو۔ ان کا ایک ضابطۂ قوانین اور ان قوانین کو نافذ کرنے والی ایک اتھارٹی۔ امت کے لئے واحد ضابطۂ قوانین مرتب کرنے کی اسکے سوا کوئی شکل نہیں کہ قرآن کریم کو (جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہے) قانون کی اصل و بنیاد اور سند و حجت قرار دیا جائے۔ اور اس میں جن امور کی اصولی طور پر ہدایات دی گئی ہے ان کے جزئی احکام، باہمی مشاورت سے خود متعین کئے جائیں۔ ایسا کرنے میں، فقہ اور روایات سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔ ان میں جو قوانین ایسے ہوں جو قرآن کے خلاف نہ جاتے ہوں اور ہمارے زمانے کے تقاضے پورے کرتے ہوں، انہیں علیٰ حالہٖ رکھ لیا جائے۔ جو ان تقاضوں کو پورا نہ کرتے ہوں، ان میں مناسب ترمیم کرلی جائے یا ان کی جگہ نئے قوانین مرتب کرلئے جائیں۔ اس قسم کے قوانین تدریجاً بنائے اور نافذ کئے جائیں۔

صدر ایوب کا نظریہ

اب دیکھنا باقی ہے کہ اس باب میں ہمارے حکمران طبقہ کا کیا نظریہ ہے۔ اس طبقہ کی سب سے زیادہ مستند نمائندگی، بہرحال، صدر ایوب خان کرتے ہیں۔ انہوں نے

ئے تفصیل کے لئے دیکھئے، سلیم کے نام خطوط (جلد دوم) میں متعلقہ خطوط۔

عسکری انقلاب کی دوسری سالگرہ کی تقریب پر اپنی نشری تقریر میں کہا تھا۔

علامہ اقبالؒ نے جن کا شمار عصر حاضر میں، روح اسلامی کے بہترین روشن دماغ ترجمانوں میں ہوتا ہے کس قدر سچی بات کہی ہے کہ اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیات کلی کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ ایک معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم وضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر و تبدل کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان نہیں ——— وہ تغیر جسے قرآن کریم نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ——— تو اس سے زندگی جو حتماً متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو سیاسی اور روحانی دوائر میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ ابدی اقدار پر ان کی گرفت نہیں رہی تھی۔ اور گزشتہ کئی صدیوں میں اسلام کی قوت میں جو ضعف آیا ہے تو اس کی وجہ یہ جمود و تعطل تھا۔

اس کے بعد انہوں نے پھر علامہ اقبالؒ کے یہ الفاظ پیش کئے۔

قرآن کریم کی اہم تعلیمات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل تخلیق ہے، اس لئے ہر نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل آپ تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں اپنے اسلاف کے علمی سرمایہ سے راہنمائی لے لیکن اسلاف کے فیصلے ان کی راہ میں روک نہیں بن سکتے۔

انہوں نے دستور پاکستان کے سلسلہ میں دسمبر ۱۹۵۹ء میں کہا کہ۔

جہاں تک اسلامی اصولوں کا تعلق ہے پاکستان کا دستور یقیناً ان کا آئینہ دار ہوگا لیکن یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام کے اصول غیر متبدل رہتے ہیں لیکن ان کی جزئیات، تفصیلات اور طور طریقے حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان جزئیات کو ہمارے موجودہ حالات کے مطابق مرتب ہونا چاہیئے۔ (پاکستان ٹائمز۔ ۱۸/۱۲/۵۹)

پھر انہوں نے ۱۳ر جولائی سن ۱۹۶۰ء کو، ادارہ تحقیقات اسلامی کے گورنروں کے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا۔

اس امر کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ اسلام کے بنیادی اصول کون سے ہیں، اور جن

طریقوں سے ان اصولوں کو عمل میں لایا گیا تھا وہ کیا ہیں۔ یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ اس باب میں کوئی الجھن باقی نہ رہے کہ اسلام میں کون سی باتیں غیر متبدل ہیں اور کون سی ایسی جن میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔

انہوں نے ۱۹۶۱ء میں عید الاضحیٰ کے موقعہ پر قوم کے نام اپنی نشری تقریر میں فرمایا کہ:۔

جہاں تک اسلام کے اصولوں کا تعلق ہے اسے خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں وضاحت سے بیان فرما دیا ہے ...... اسلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اصول ازلی اور ابدی ہیں اور ان پر ہر زمانہ اپنے تقاضوں کے مطابق چل سکتا ہے۔ سنت، حدیث، فقہ، اس بات کا ثبوت ہیں۔ یہ سب ہمارے لئے روشنی کے مینار ہیں جو ہمیں بتاتے ہیں کہ کس زمانے میں اور کن کن حالات میں خدا کے احکام پر کس کس طرح عمل کیا گیا۔

اسی اصول کے تابع ہم نے مشورہ دیا تھا کہ آئین پاکستان میں یہ شق درج کر دی جائے کہ مملکت کا سارا کاروبار قرآن کریم کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے گا، اور اس کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں ملک کے قوانین مرتب کئے جائیں گے۔ لیکن آئین پاکستان میں یہ شق درج نہ کی گئی۔ اس میں یہ کہا گیا کہ ملک کا کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں ہوگا۔ اور اس کے بعد، مذہبی پیشوائیت کے تقاضوں کے ماتحت اس شق کو یوں بدل دیا گیا کہ ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔

دشوار مرحلہ اب اتنا واضح ہے کہ (کم از کم) صدرِ مملکت اس حقیقت سے باخبر ہی نہیں بلکہ متفق ہیں کہ غیر متبدل قرآنی احکام و اصول ہی ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں تفصیلی احکامات، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہمیں خود مرتب کرنے چاہئیں۔ جو قوانین صدیوں پہلے کے حالات کی روشنی میں مرتب کئے گئے تھے وہ آج چل نہیں سکتے۔ لیکن معلوم نہیں ان کی وہ کیا دشواریاں تھیں جن کے پیشِ نظر وہ اپنے اس نظریہ کو آئینی شکل نہ دے سکے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ ملک کو اس انتشار سے بچانا چاہتے ہیں جو مذہبی پیشوائیت، ملک کی جاہل آبادی کے جذبات کو برانگیخت کرکے، پیدا کرنا چاہتی ہے۔ وہ جاہل آبادی جس کی یہاں اس قدر اکثریت ہے اور جسے مذہب کے نام پر بڑی آسانی سے مشتعل کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں اس سے اتفاق ہے کہ ملک میں امن قائم رکھنا ضروری ہے۔ لیکن اس سے پھر یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ ان حالات میں تو ملک میں اسلامی قوانین کی تدوین و تنفیذ کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ اس کیلئے امکانی صورت یہی ہو سکتی تھی کہ ملک میں اس نظریہ کی نشر و اشاعت عام کی جاتے اور دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کے اثر کو کم کیا جاتے۔ لیکن یہاں ہوا یہ کہ اس نظریہ کی نشر و اشاعت

کا تو کوئی اہتمام نہ کیا گیا اور ملک میں مذہبی پیشوائیت کا زور بڑھتا چلا گیا ـــــ اور شومئی قسمت کہ ایسا ہونے میں خود حکومت بھی بالواسطہ اور بلاواسطہ اس کی موید تھی۔

دُور رس نتائج

اس کا نتیجہ اتنا ہی نہیں کہ پاکستان کے اسلامی مملکت بننے کے امکانات دن بدن دور ہٹتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کا اثر بڑا دور رس ہے۔ اسلام کے متعلق دنیا میں یہ خیال عام ہو رہا تھا کہ یہ نظام آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے حالات میں تو چل سکتا تھا، اب یہ محض ایک "چلا ہوا کارتوس" ہے، یا ایک مقدس مقبرہ جس کے مجاور مسلمانانِ عالم ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اس خطرناک تاثر کو دور کرنے کے لئے، پاکستان کا تصور پیش کیا اور کہا کہ یہ مملکت ہمارے اس دعوے کی صداقت کا بین ثبوت ہو گی کہ اسلام اب بھی ایک زندہ نظامِ حیات ہے جو دنیا کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔ چنانچہ، پاکستان کی تشکیل کے بعد، دنیا کی نگاہیں اس طرف لگ گئیں کہ دیکھیں اب اسلام کس طرح ایک زندہ نظام کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ پاکستان، اس وقت تک ہمارے اس دعوے کی شہادت پیش کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اور صورتِ حالات اگر یہی رہی، تو یہ، اس دعوے کی شہادت کبھی بھی نہیں بن سکے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ دنیا نے جو تصور اسلام کے متعلق قائم کیا تھا، (کہ اس کی حیثیت اب محض آثارِ قدیمہ کی سی ہے) وہ اسے مبنی بر حقیقت سمجھ لے گی ـــــ اور ایسا سمجھنے میں وہ حق بجانب بھی ہو گی ـــــ دنیا، ایسا کب سمجھے گی، اسے تو چھوڑیئے، خود پاکستان کی نئی نسل (جو اندھی عقیدت کی بنا پر اسلام کے متعلق کسی دعوے کو ماننے کے لئے تیار نہیں، اور نہ ہی اسے یا کسی اور کو ایسا کرنا چاہیئے) اس تاثر کو لئے ہوئے ابھر رہی ہے کہ اسلام کی کہانیاں "محض" اساطیر الاولین ہیں۔ اب اس زمانے میں اس کا چلن ممکن نہیں۔ دنیا بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ صدر ایوب نے، (۱۳ر جولائی سنہ ۱۹۶۰ء کو، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے گورنروں کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ

> بیس تیس برس کے بعد کوئی شخص تمہاری آواز سننے کے لئے تیار نہیں ہو گا جب تک تم ایسی باتیں نہ کہو گے جو عقلِ عامہ کو اپیل کریں اور زمانے کے تقاضوں کو پورا کریں۔

زمانہ کی برق رفتاری، اب کسی قوم کو بیس تیس برس کی مہلت دینے کے لئے تیار نہیں۔ اب صدیوں کے مرحلے دنوں میں طے ہو جاتے ہیں۔ اس لئے پاکستان کی نئی پود ان فرسودہ باتوں کو سننے کے لئے تیار نہیں جو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کی جاتیں اور "اسلامیات" کے نام سے انہیں اسکولوں اور

کالجوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ اور چونکہ اسلام اس شکل میں ان کے سامنے آ نہیں رہا جو عقلِ عامہ کو اپیل کرے اور زمانے کے تقاضوں کو پورا کرے' اس لئے وہ خود دین ہی سے برگشتہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

یہ نتیجہ ہے ہماری موجودہ روش کا — یعنی باہر کی دنیا اسلام کے متعلق یقینی طور پر اس نتیجہ پر پہنچ رہی ہے کہ اس میں اب زمانے کے ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں اور خود پاکستان کی نئی پود اسلام سے برگشتہ ہوتی جا رہی ہے۔

اب بھی وقت ہے کہ اس مسئلہ کو سنجیدگی سے ہاتھ میں لے لیا جائے۔ اور اس سلسلہ میں کرنے کا کام وہی ہے جس کی ہم نے گذشتہ صفحات میں نشان دہی کی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو پھر پاکستان ہی میں نہیں' پورے عالمِ اسلام میں' اسلام کے ایک زندہ نظامِ زندگی بننے کے امکانات باقی نہیں رہیں گے اور اسلام کا گہوارہ کوئی ایسا ملک ہی بن سکے گا جہاں پہلے سے اسلام موجود نہ ہو — اس لئے کہ زندہ قوموں نے تو پھر پھرا کر آخر الامر اسی طرف آنا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور نظامِ زندگی کے تقاضے پورے کر نہیں سکتا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است
ساز قرآں را نواہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر
آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
حق اگر از پیشِ ما بردارد ش !
پیشِ قومے دیگرے بگذاردش
ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند !

قرآن' ذکر للعالمین (تمام نوعِ انسانی کے لئے ضابطۂ ہدایت) ہے۔ یہ نہ کسی خاص خطۂ زمین میں مقید رہ سکتا ہے' نہ کسی خاص قوم میں محصور — یہ وہ ساز ہے کہ جو بھی ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لے' بادۂ زندگی اس کے لئے مقدر ہو جاتا ہے — لہٰذا ہمارے لئے وجۂ تاسف خود اپنی محرومی کا احساس ہے۔ قرآن کے مستقبل کا غم نہیں۔ قرآن تو نوعِ انسان کی (DESTINY) ہے۔ اس لئے اس کے مستقبل کا غم کیسے ہو سکتا ہے ؟

⁂

تاریخ یا قرآن ——

ایمان کس پر ہونا چاہیئے؟

شیخ محمد طاہر گجراتی "تذکرۃ الموضوعات" میں لکھتے ہیں، کہ جو بناری، ابن عکاشہ اور محمد بن تمیم فاریابی نے دس ہزار سے زیادہ حدیثیں وضع کیں۔ عقیلی کا قول ہے کہ زنادقہ نے بارہ ہزار حدیثیں وضع کیں۔ ابن ابی العوجاء نے مرتے وقت کہا کہ اس نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دیا ہے۔ القضاعی کی پوری کی پوری کتاب وضعی حدیثوں پر مشتمل ہے۔ "وصایا علی" نامی کتاب میں بجز پہلی حدیث کے سب حدیثیں وضعی ہیں۔ موسیٰ بن جعفر کی کتاب جو ہزار حدیثوں کا مجموعہ تھی، وضع کردہ تھی۔

جب ہم تاریخ میں اس قسم کے واقعات پڑھتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ لوگ کس قدر چالاک اور ہوشیار تھے کہ عمر بھر جھوٹی روایات گھڑتے رہے اور معاشرہ میں معتبر کے معتبر (بلکہ مقدس بزرگ) بنے رہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں آگئی جب ہم نے خود اپنے معاشرہ میں ایسا ہوتے دیکھا۔ اب جھوٹی روایات وضع کرنے کا تو امکان نہیں، لیکن جھوٹی روایات کو پھیلانے اور اس طرح اسلام کو بدنام کرنے کے امکانات تو موجود ہیں۔ ایسا کرنے والوں میں سرِ فہرست نام ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا ہے جنہوں نے اپنی ساری مساعی اس "جہادِ عظیم" میں صرف کر دی ہے اور اس کے باوجود، نہ صرف یہ کہ معاشرہ میں معتبر کے معتبر بن رہے ہیں بلکہ اقامتِ دین اور احیائے اسلام کے سب سے بڑے مدعی بھی ہیں۔ ان کے اس جہادِ عظیم کی "تازہ ترین کڑی" ان کی کتاب خلافت و ملوکیت ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ جن مضامین پر یہ کتاب مشتمل ہے، وہ پہلے ان کے ماہنامہ ترجمان القرآن میں شائع ہوتے تھے۔ ہم نے ان پر، اکتوبر ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ "اسلام کے خلاف کتنی بڑی سازش ہے۔" اب وہی مضامین کتابی شکل میں سامنے لائے گئے ہیں۔ اس کتاب کے متعلق ہم ایک فقرہ میں اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ یورپ کے متعصب پادریوں اور بھارت کے دریدہ دہن

آریوں نے، حضورؐ رسالتمآبؐ اور صحابہ کبارؓ کی سیرت طیبہ کو مسخ شدہ صورت میں پیش کرنے کی جو جسارت فرداً فرداً کی تھی، اس کتاب میں وہ سب کچھ بہ حیثیت مجموعی یک جا کر دیا گیا ہے۔ اس کی مثالیں پیش کرنے سے ہمارا دل کانپتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے منظم پراپیگنڈے نے مودودی صاحب کو ایک ایسا مقام عطا کر دیا ہے کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے اسے باور ہی نہیں کیا جا سکے گا جب تک ان کی کتاب میں سے اس کی مثالیں نہ پیش کی جائیں۔ لہٰذا ہم دل پر پتھر رکھ کر، اس کی صرف ایک ایک، دو دو، مثالیں پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں سب سے پہلے خود ذات رسالت مآبؐ کو لیجئے۔ اس میں ایک صحابی حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے متعلق لکھا ہے کہ وہ کاتب وحی تھے۔ پھر مرتد ہو کر مکے چلے گئے۔ فتح مکہ کے وقت

> جب مکہ میں امن و امان ہو گیا اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم اہل مکہ سے بیعت لینے کے لئے تشریف فرما ہوئے تو حضرت عثمان رضؓ ان کو لے کر حضورؐ کے سامنے پہنچ گئے۔ اور ان کے لئے عفو و تقصیر کی درخواست کرتے ہوئے گزارش کی کہ ان کی بیعت بھی قبول فرمالیں حضورؐ خاموش رہے، جتنے کہ تین مرتبہ ان کی درخواست پر خاموش رہنے کے بعد آپ نے ان سے بیعت لی۔ اور پھر صحابہؓ کرام سے فرمایا کہ تم میں کوئی ایسا بھلا آدمی نہ تھا کہ جب میں بیعت نہیں لے رہا تھا تو وہ اٹھ کر انہیں قتل کر دیتا۔ عرض کیا کہ ہم آپؐ کے اشارے کا انتظار کر رہے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ نبی کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ آنکھ سے خفیہ اشارے کرے۔
>
> (خلافت و ملوکیت ص ۲۳۸)

ہم اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ قارئین خود اندازہ لگالیں کہ اس سے حضورؐ نبی اکرمؐ کی کس قسم کی سیرت سامنے آتی ہے!

اس ضمن میں ہم اتنا اضافہ ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ پہلا موقعہ نہیں جب مودودی صاحب نے حضورؐ رسالتمآبؐ کی شان اقدس میں اس طرح گستاخی کی ہو۔ وہ اکثر ایسا کرتے رہتے ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں جب ان کی جماعت کے کچھ ذمہ دار ارکان ان سے، اس بنا پر الگ ہوتے تھے کہ یہ جماعت کے تنظیمی مرحلہ میں جن اصولوں کی اشاعت کیا کرتے تھے، پاکستان میں حصول قیادت کے جنون میں ان سب کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے تو مودودی صاحب نے اس کے جواب میں لکھا تھا کہ میں نے یہ کونسی انوکھی بات کی ہے (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خود رسول اللہ نے ایسا ہی کیا تھا۔ وہ مکے کی زندگی میں مساوات انسانیہ کی تعلیم دیتے رہے لیکن جب مدینہ میں حکومت قائم کرنے کا وقت آیا تو یہ کہہ کر کہ الائمہ من القریش، ان تمام اصولوں کو پس پشت ڈال دیا۔ اور حکومت اپنے خاندان میں محصور کر لی۔ (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۰ء)

اسی طرح ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہؐ کی ایک بیوی (حضرت ماریہ قبطیہؓ) کے متعلق یہ افواہ اڑا دی گئی کہ (معاذ اللہ) ان کا اپنے چچازاد بھائی کے ساتھ ناجائز تعلق ہے۔ اس پر حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ تم جاؤ اور اگر وہ شخص وہاں موجود ہو تو اسے قتل کر دو۔ حضرت علیؓ پہنچے تو وہ شخص حوض میں نہا رہا تھا۔ آپ نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر باہر کھینچا۔ اور جب وہ یوں برہنہ سامنے آیا تو دیکھا کہ وہ مخنث ہے۔ مستفسر نے مودودی صاحب سے پوچھا تھا کہ کیا اس قسم کی روایت صحیح ہو سکتی ہے۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ بے شک یہ روایت صحیح ہے اور اس کے لئے اپنی طرف سے دلائل بھی دیئے۔ (رسائل و مسائل جلد دوم ص۴۵)

یہ ہے ان کی ذہنیت خود ذاتِ رسالتمآبؐ کے متعلق!

اب آگے بڑھیے۔ حضور نبی اکرمؐ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے اپنی عدیم النظیر تعلیم و تربیت سے صحابہؓ کی ایک ایسی جماعت پیدا کی جو شرفِ انسانیت کی انتہائی بلندیوں پر فائز تھی اور جنہیں خود بارگاہِ خداوندی سے "مومن حقاً" کی سند عطا ہوئی۔ لیکن مودودی صاحب کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ صحابہ کبارؓ کی سیرت کو ایسے مسخ شدہ رنگ میں پیش کیا جائے کہ لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس نتیجہ تک پہنچ جائیں کہ جس درخت کے پھل ایسے ہیں وہ درخت کیسا ہوگا؟ صحابہ کبارؓ کے متعلق وہ اس سے پہلے بھی (معاذ اللہ) کیچڑ اچھالنے میں کمی نہیں کیا کرتے تھے۔ مثلاً انہوں نے ایک مجلس ذکر حسینؓ میں اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ جب صحابہؓ نے (جن کی تعداد دو سو کے قریب تھی) یزید کی بیعت کر لی تھی تو امام حسینؓ نے بھی ایسا کیوں نہ کر لیا۔ کہا تھا کہ جب غیر اسلامی حکومت پوری طاقت سے قائم ہو تو اس کے خلاف اٹھنا ہمارا شمار کا کام نہیں ہوتا۔ جب غیر اسلامی حکومت بگڑ رہی ہو تو مسلمانوں کا کام تماشائی بن کر بیٹھ رہنا نہیں ہوتا (ایشیا ۔ مؤرخہ ۱۰ جون ۱۹۷۲ء) لیکن زیرِ نظر کتاب میں تو وہ پوری طرح کھل کھیلے ہیں۔ وہ ان مراحل کا ذکر کرتے ہوئے۔ جن سے گزرتے ہوئے (بقول ان کے) خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی۔ لکھتے ہیں کہ:-

> اس تغیر کا آغاز ٹھیک اس مقام سے ہوا جہاں سے اس کے رونما ہونے کا حضرت عمرؓ کو اندیشہ تھا۔ اپنی وفات کے قریب زمانے میں سب سے بڑھ کر جس بات سے وہ ڈرتے تھے وہ یہ تھی کہ کہیں ان کا جانشین اپنے قبیلے اور اپنے اقرباء کے معاملہ میں اس پالیسی کو نہ بدل دے جو رسول اللہؐ کے زمانے سے ان کے زمانے تک چلی آ رہی تھی۔ (ص۱۰۶)

یہ تھا (بقول مودودی صاحب) حضرت عمرؓ کا خدشہ۔ اور وہ مرحلہ جس سے خلافت، مبدل بہ ملوکیت ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہوا کیا؟

> ان کے بعد جب حضرت عثمانؓ جانشین ہوئے تو رفتہ رفتہ اس پالیسی سے ہٹتے چلے

> گئے۔ انہوں نے پے درپے اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے اہم عہدے عطا کئے اور ان کے ساتھ دوسری ایسی رعایات کیں جو عام طور پر لوگوں میں ہدفِ اعتراض بن کر رہیں۔ (ص ۱۰۶)

گویا، عام صحابہ ؓ ہی نہیں۔ خلفائے راشدین میں سے تیسرے خلیفہ نے ہی اقربا نوازی اور اعزہ پروری شروع کر دی۔ اور اس طرح خلافت کے ملوکیت میں بدل ہونے کے شجرِ خبیثہ کا بیج خود حضرت عثمان ؓ کے ہاتھوں بویا گیا۔ (استغفر اللہ!)۔ یہ اعزہ اور اقربا، جنہیں حضرت عثمان ؓ نے اتنے اتنے بڑے عہدے دے دیئے تھے کس سیرت و کردار کے مالک تھے، وہ بھی سن لیجئے۔ مثلاً ان میں حضرت ولید بن عقبہ ؓ بھی تھے۔ ان کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

> حضرت عثمان ؓ نے ان کو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی جگہ کوفہ جیسے بڑے اور اہم صوبہ کا گورنر بنا دیا، وہاں یہ راز فاش ہوا کہ یہ شراب نوشی کے عادی ہیں حتّٰی کہ ایک روز انہوں نے صبح کی نماز چار رکعت پڑھا دی اور پھر پلٹ کر لوگوں سے پوچھا: "اور پڑھاؤں"؟ (صفحہ ۱۱۲)

یہ ولید بن عقبہ ؓ کون تھے؟ صغار صحابہ ؓ میں سے ایک صحابی۔ حضرت عثمان ؓ کے ماں جائے بھائی، حضرت ابوبکر صدیق ؓ اور حضرت عمر ؓ کے زمانہ میں قابلِ اعتماد مناصب پر سرفراز رہے۔ ان کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ "شراب نوشی کے عادی تھے۔ حتّٰی کہ نماز بھی بہ حالتِ نشہ پڑھایا کرتے تھے۔ یا للعجب!

حضرت معاویہ ؓ، رسول اللہؐ کے جلیل القدر صحابی اور کاتبِ وحی تھے۔ ان کی خلافت کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

> حضرت معاویہ ؓ کی خلافت اس نوعیت کی خلافت نہ تھی کہ مسلمانوں کے بنانے سے وہ خلیفہ بنے ہوں۔ اور اگر مسلمان ایسا کرنے پر راضی نہ ہوتے تو وہ نہ بنتے۔ وہ بہرحال خلیفہ ہونا چاہتے تھے۔ انہوں نے لڑ کر خلافت حاصل کی۔ مسلمانوں کے راضی ہونے پر ان کی خلافت کا انحصار نہ تھا۔ لوگوں نے ان کو خلیفہ نہیں بنایا، وہ خود اپنے زور سے خلیفہ بنے۔ (صفحہ ۱۵۸)

آپ سوچئے کہ دنیائے سیاست میں اس سے بدتر بھی کسی کا کردار ہو سکتا ہے کہ وہ یوں، ہلاکو اور چنگیز خاں کی طرح بزور حاکم بن بیٹھے! یہ ہے رسول اللہؐ کے ایک جلیل القدر صحابی کی وہ تصویر جو مودودی صاحب کے حسنِ قلم کے تصدق دنیا کے سامنے آتی ہے۔

یہ رہا ایک صحابی کا کردار ـــ باقی صحابہ ؓ کا کیریکٹر کیا تھا۔ وہ بھی دیکھ لیجئے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں، کہ

> حضرت امام حسن ؓ کی دستبرداری کے بعد

تمام صحابہ و تابعین اور صلحائے امت نے ان کی (حضرت معاویہ رضؓ کی) بیعت پر اتفاق کر لیا (ص۱۵۰)

یعنے تمام صحابہ رضؓ، تابعین اور صلحائے امت نے، بلا استثنا، ایک ایسے شخص کو خلیفہ برحق تسلیم کر لیا جس نے اس طرح ڈکٹیٹرانہ انداز سے حکومت حاصل کی تھی! ان میں سے ایک بھی ایسا نہ نکلا جس نے اس استبداد کے خلاف آواز بلند کی ہو۔ سبحان اللہ! کیسے بلند کردار کی حامل تھی یہ جماعت! یعنی ان میں سے، کسی سے اتنا بھی نہ ہو سکا جتنا آج مودودی صاحب (بزعم خویش) ملک سے "ڈکٹیٹرشپ" دور کرنے کے لئے کر رہے ہیں۔ اپنا کردار اتنا بلند اور صحابہ کبار رضؓ (تبع تابعین اور تمام صلحائے امت) کا کردار (معاذ اللہ) اتنا پست!

اتنا ہی نہیں۔ یہ بھی دیکھئے کہ یہ صحابہ رضؓ کیا کچھ کیا کرتے تھے! جنگ صفین کے سلسلہ میں مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

> اس وقت حضرت عمرو بن عاص رضؓ نے معاویہ رضؓ کو مشورہ دیا کہ اب ہماری فوج نیزوں پر قرآن اٹھا لے اور کہے کہ ھذا حکم بیننا و بینکم (یہ ہمارے اور تمہارے درمیان حکم ہے) اس کی مصلحت حضرت عمرو نے خود یہ بتائی کہ "اس سے علی رضؓ کے لشکر میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ کچھ کہیں گے کہ یہ بات مان لی جائے اور کچھ کہیں گے کہ نہ مانی جائے۔ ہم مجتمع رہیں گے اور ان کے ہاں تفرقہ برپا ہو جائے گا۔ اگر وہ مان گئے تو ہمیں مہلت مل جائے گی۔" (ص۱۳۹)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ

> اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ محض ایک جنگی چال تھی۔ قرآن کو حکم بنانا سرے سے مقصود ہی نہ تھا۔ (ص۱۳۹)

یہ "قرآن کو سپر بنانے" کی چال کس کی تھی؟ حضرت عمرو بن عاص رضؓ کی جو رسول اللہ کے اکابر صحابہ رضؓ میں سے ہیں اور فاتح مصر۔ اور ان کی اس چال کو بروئے کار لانے والے کون تھے؟ لامحالہ صحابہ رضؓ اور تابعین رح! انہی (حضرت عمرو بن عاص رضؓ) کے متعلق ذرا آگے چل کر لکھا ہے کہ انہوں نے (حضرت معاویہ رضؓ اور حضرت علی رضؓ کے معاملہ میں) ایک حکم کی حیثیت سے، فریق ثانی کو کتنا بڑا دھوکا دیا۔ مودودی صاحب کے الفاظ میں۔

> حضرت عمرو بن العاص رضؓ نے جو کچھ کیا وہ طے شدہ بات کے بالکل خلاف تھا۔ (ص۱۴۲)

ہم ناظرین سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہم جو تاریخ عالم میں میکیاولی سیاست کی روباہ بازیوں اور فریب کاریوں کے ابلیسانہ قصے پڑھا کرتے ہیں، مودودی صاحب نے صحابہ کبار رضؓ کی جو تصویر کھینچی ہے کیا وہ ان سے مختلف

ہے اگر یہی کچھ (معاذ اللہ) یہ حضرات بھی کیا کرتے تھے۔ تو اسلام کی درخشندہ تعلیم اور رسول اللہ کی بے مثال تربیت نے ان کے اندر کیا تبدیلی پیدا کی تھی! کیا اس تعلیم کو دنیا کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے جس کا ما حصل اس سیرت و کردار کے لوگ تھے؟ کیا رسول اللہ کے " یعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم " کی کاوشوں کا نتیجہ یہی تھا؟

اب ایک اور واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔ یزید کو ولی عہد نامزد کرنے کے سلسلہ میں مودودی صاحب رقمطراز ہیں:۔

اس تجویز کی ابتدا حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کی طرف سے ہوئی۔ حضرت معاویہؓ انہیں کوفے کی گورنری سے معزول کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انہیں اس کی خبر مل گئی۔ فوراً کوفے سے دمشق پہنچے اور یزید سے مل کر کہا کہ " صحابہؓ کے اکابر اور قریش کے بڑے لوگ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ امیر المومنین تمہارے لئے بیعت لے لینے میں تامل کیوں کر رہے ہیں " یزید نے اس بات کا ذکر اپنے والد ماجد سے کیا۔ انہوں نے حضرت مغیرہؓ کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا بات ہے جو تم نے یزید سے کہی۔ حضرت مغیرہؓ نے جواب دیا۔ " امیر المومنین! آپ دیکھ چکے ہیں کہ قتل عثمانؓ کے بعد کیسے کیسے اختلافات اور خون خرابے ہوئے۔ اب بہتر یہ ہے کہ آپ یزید کو اپنی زندگی ہی میں ولی عہد مقرر کر کے بیعت لے لیں تاکہ اگر آپ کو کچھ ہو جائے تو اختلاف برپا نہ ہو۔" حضرت معاویہؓ نے پوچھا " اس کام کو پورا کر دینے کی ذمہ داری کون لے گا؟" انہوں نے کہا " اہل کوفہ کو میں سنبھال لوں گا اور اہل بصرہ کو زیاد۔ اس کے بعد پھر اور کوئی مخالفت کرنے والا نہیں ہے۔" یہ بات کر کے حضرت مغیرہؓ کوفہ آئے اور دس آدمیوں کو تیس ہزار درہم دے کر اس بات پر راضی کیا کہ ایک وفد کی صورت میں حضرت معاویہؓ کے پاس جائیں اور یزید کی ولی عہدی کے لئے ان سے کہیں۔ یہ وفد حضرت مغیرہؓ کے بیٹے موسےٰ بن مغیرہؓ کی سرکردگی میں دمشق گیا اور اس نے اپنا کام پورا کر دیا۔ بعد میں حضرت معاویہؓ نے موسےٰ کو الگ بلا کر پوچھا " تمہارے باپ نے ان لوگوں سے کتنے میں ان کا دین خریدا ہے؟" انہوں نے کہا " تیس ہزار درہم میں " حضرت معاویہؓ نے کہا " تب تو ان کا دین ان کی نگاہ میں بہت ہلکا ہے۔" (ص ۱۴۹-۱۵۰)

اس "افسانہ" کے بنیادی کردار حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور حضرت معاویہؓ ہیں جو رسول اللہ کے

واجب الاحترام صحابہ ہیں۔ اور ثانوی کردار وہ جنہیں (اگر صحابہؓ نہ بھی تصور کیا جائے تو بھی کم از کم تابعینؒ ہیں۔ اور اس کا "پلاٹ" یہ ہے کہ

(۱) حضرت مغیرہؓ کو خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ امیرالمومنین انہیں گورنری کے عہدہ سے ہٹا دیں گے۔

(۲) اس کے لئے وہ ایک سازش کی سوچتے ہیں جس میں حضرت معاویہؓ کی دکھتی ہوئی رگ کو پکڑنا مقصود ہے۔

(۳) اس سازش میں پہلے، امیرالمومنین کے بیٹے کو خلافت کا لالچ دے کر شریک کیا جاتا ہے۔ اور اس کی وساطت سے امیرالمومنین کو اس پر آمادہ کیا جاتا ہے۔

(۴) امیرالمومنین اس تجویز کی کمزوری کے پیش نظر اس کی کامیابی کے متعلق تشویش محسوس کرتے ہیں تو ان سے کہا جاتا ہے کہ آپ بے فکر رہیئے۔ یہ سب کچھ ہو جائے گا۔

(۵) اس اسکیم کی کامیابی کے لئے صرف تیس ہزار درہم میں، دس آدمیوں کا دین خریدا جاتا ہے۔ انکا سرکردہ خود حضرت مغیرہؓ کا بیٹا ہے۔

(۶) ان لوگوں کی طرف سے پیش کردہ تجویز کو امیرالمومنین، امت کی خواہش کا نام دے کر مملکت میں مشہور کرتے ہیں اور یوں یہ اسکیم کامیاب ہو جاتی ہے۔

دیکھ لیا آپ نے نقشہ ان حضرات کی سیرت و کردار کا جنہیں خدا نے مومن حقا (سچے اور سچے) کہہ کر پکارا تھا۔ اور رسول اللہ نے جنہیں آسمانِ اخلاق و اخلاص کے ستارے (کالنجوم) قرار دیا تھا!؎ لیکن اگر ابھی کچھ اور سننے کی بھی ضرورت ہو تو ایک واقعہ اور بھی سن لیجئے۔ لیکن اسے سننے سے پہلے حیا سے کہیئے کہ وہ ایک طرف کو ہو جائے اور غیرت سے تاکید کیجئے کہ منہ دوسری طرف موڑ لے۔ یہ واقعہ ہے ۶۳ھ (یعنی رسول اللہ کی وفات سے صرف پچاس ایک سال بعد) کا۔ اس وقت ابھی صحابہؓ کی اچھی خاصی تعداد بھی زندہ موجود ہے اور باقی امت تابعین پر مشتمل ہے۔ مدینہ صلحائے امت کا مرکز ہے۔ یزید کی فوج مدینہ پر حملہ کرتی ہے ــــ یاد رہے کہ اس فوج کے افسر اور سپاہی بھی تاتار کے وحشی نہیں، صحابہ یا تابعین کے زمرے میں شمار

؎ مودودی صاحب نے رسائل و مسائل (حصہ دوم) میں خود اس حدیث کو نقل کیا ہے جس میں ارشاد ہے کہ اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم: میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے جس کسی کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے ہم مودودی صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا حضرت معاویہؓ یا حضرت عمرو بن العاصؓ ان صحابہ کے زمرے میں شامل ہیں یا نہیں اور اگر شامل ہیں تو کیا انکی جس سیرت کے اقتدا سے ہم ہدایت یافتہ ہو سکتے ہیں وہ وہی ہے جسے مودودی صاحب نے پیش فرمایا ہے۔ سوچئے کہ یہ بات ان حضرات سے آگے بڑھ کر خود رسول اللہ تک پہنچ رہی ہے۔

ہونے والے مسلمان ہیں۔ اس حملہ کے سلسلہ میں مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ

وحشی فوجیوں نے گھروں میں گھس گھس کر بے دریغ عورتوں کی عصمت دری کی۔ حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ حتیٰ قیل انہ حملت الف امرأۃ فی تلک الایام من غیر زوج۔ کہا جاتا ہے کہ ان دنوں میں ایک ہزار عورتیں زنا سے حاملہ ہوئیں۔ (صفحہ)

ان "وحشی فوجیوں" کو تو چھوڑیئے، لیکن سوچئے کہ مدینۃ النبی کے یہ مسلمان؛ اپنی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں، بیویوں کے ساتھ (معاذ اللہ) یہ کچھ بے محابا ہوتے دیکھتے رہے اور کسی کی غیرت جوش میں نہ آئی! ان کے اسلام کو تو چھوڑیئے۔ معلوم نہیں ان کی جاہلیت کے زمانے کی حمیت کو بھی کیا ہو گیا تھا کہ اپنی عصمت مآب خواتین کو یوں زنا سے حاملہ ہوتے دیکھا کئے، اور کسی کی غیرت نے کوئی تقاضا نہ کیا؟ پھر یہ بھی سوچئے کہ اس سے جو ایک ہزار ناجائز بچے پیدا ہوتے ہوں گے ان کی نسل آج تک چلتی آ رہی ہے! اتنی بڑی تعداد سے تو ایسا مترشح ہوتا ہے کہ وہاں شاید ہی کوئی گھرانہ اس سے محفوظ رہا ہو۔ سے

اے محمد اگر قیامت را براری سر ز خاک
سر برار و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں!

یہ ہے اسلام کے سب سے زیادہ مایہ ناز و قابلِ فخر عہد کا وہ نقشہ جسے مودودی صاحب نے یہ کہہ کر پیش کیا ہے۔

اگر ہم صحتِ نقل اور معقول و مدلل اور متوازن طریقے سے اس تاریخ کو خود بیان نہ کریں گے۔ اور اس سے صحیح نتائج نکال کر مرتب طریقے سے دنیا کے سامنے پیش نہ کریں گے تو مغربی مستشرقین اور غیر معتدل ذہن و مزاج رکھنے والے مسلمان مصنفین، جو اسے نہایت غلط رنگ میں پیش کرتے رہے ہیں اور آج بھی پیش کر رہے ہیں، مسلمانوں کی نئی نسل کے دماغ میں اسلامی تاریخ ہی کا نہیں بلکہ اسلامی حکومت اور اسلامی نظامِ زندگی کا بھی بالکل غلط تصور بٹھا دیں گے۔ (صفحہ ۳)

یعنی مودودی صاحب اپنے اس معرکہ آرا کارنامے سے امت کے سر پر اتنا بڑا احسان بھی دھر رہے ہیں کہ اگر وہ اس تاریخ کو اس رنگ میں پیش نہ کرتے تو مسلمانوں کی آنے والی نسلیں اسلام کے متعلق بڑا غلط تصور اپنے ذہن میں قائم کر لیتیں۔ اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو!

مودودی صاحب نے اپنا یہ عظیم کارنامہ اُمّت کے حضور پیش کیا ہے اور ان کے متوسلین (جن میں سے بیشتر ان کے تنخواہ دار ملازم ہیں) اس کے حق میں پراپیگنڈہ کے لئے مسلسل مصروفِ جدوجہد ہیں۔ ان کی طرف سے پیش کردہ دلیل یہ ہے کہ مودودی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، ہماری تاریخ کی کتابوں سے لکھا ہے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا۔ پھر انہیں موردِ الزام کیوں قرار دیا جارہا ہے؟ یہ دلیل بظاہر بڑی وزنی نظر آتی ہے لیکن اس سلسلہ میں ہم صرف دو باتیں پوچھنا چاہتے ہیں۔ اول یہ کہ جب یورپ کے متعصب مستشرق، یا کوئی راج پال، ہماری انہی تاریخوں سے، ایسا ہی کچھ، نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کے خلاف لکھتے اور شائع کرتے ہیں تو انہیں گردن زدنی کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ ان کی طرف سے یہ عذر کیوں قبول نہیں کیا جاتا کہ یہ سب کچھ خود مسلمانوں کی تاریخ میں موجود ہے۔ انہوں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا! جو کچھ مودودی صاحب نے لکھا ہے اگر اس کے حق میں یہ دلیل محکم قرار دی جائے (کہ یہ سب کچھ انہوں نے ہماری تاریخ سے لیکر لکھا ہے) تو پھر ان معاندینِ اسلام کی دریدہ دہنی کے خلاف بھی مسلمانوں کو لب کشائی کا کوئی حق نہیں پہنچنا چاہیئے۔ اور اگر ان کا ایسا کرنا انہیں موردِ الزام قرار دے سکتا ہے تو مودودی صاحب اس الزام سے کس طرح بری الذمہ سمجھے جا سکتے ہیں؟ آخر ان دونوں میں فرق کیا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی شخص کا مسلک یہ ہو کہ جو کچھ ہمارے اسلاف کی کتابوں میں لکھا ہے۔ وہ تنقید سے ماوراء ہے، اسے من وعن تسلیم کرنا چاہیئے' تو اس سے گفتگو کسی اور نہج سے کی جائے گی۔ لیکن مودودی صاحب کا یہ مسلک نہیں۔ وہ (کتب تاریخ تو ایک طرف) کتب احادیث کو بھی تنقید سے بلند نہیں قرار دیتے۔ وہ ان احادیث کو بھی مسترد کر دیتے ہیں جو ان کے اصولِ درایت پر پوری نہ اتریں خواہ وہ صحیفہ کے کسی مجموعہ میں بھی کیوں نہ ہوں۔ مثلاً وہ اپنی کتاب رسائل و مسائل (حصہ اول) میں لکھتے ہیں۔

> اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہؐ کی طرف منسوب ہو، اس کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریق مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسول مان لینا ضروری ہے' جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (ص ۲۹۰)

چنانچہ:

> یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو جوں کا توں بلاتنقید قبول کر لینا چاہیئے۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۵۲ء)

لہذا مودودی صاحب نے اپنی زیر نظر کتاب (خلافت وملوکیت) میں کتب تاریخ کی سند سے جو کچھ لکھا ہے، انہوں نے اسے محض اس لئے نہیں لکھ دیا کہ ان کتابوں میں ایسا ہی لکھا ہے۔ انہوں نے یہ کچھ اس لئے لکھا ہے کہ وہ اسے اپنے معیار کے مطابق، صحیح سمجھتے ہیں۔ ان کا اپنا عقیدہ یہی ہے کہ رسول اللہ کی سیرت بھی (معاذ اللہ) اسی قسم کی تھی اور صحابہؓ کی بھی۔

آپ نے دیکھ لیا کہ مودودی صاحب کے نزدیک (کتب تاریخ تو ایک طرف) کتب احادیث بھی اس قابل نہیں کہ ان کے مندرجات، سب کے سب، جوں کے توں صحیح تسلیم کر لئے جائیں۔ ان میں صحیح باتیں بھی ہیں اور غلط بھی۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی درایت کے مطابق صحیح باتوں کو قبول کر لیں اور غلط کو مسترد کر دیں۔

لیکن اس کے بعد آپ دیکھئے کہ جب ان کی کتاب (خلافت وملوکیت) پر یہ اعتراض کیا گیا کہ وہ تاریخ کی اس قسم کی وضعی روایات کو صحیح کیسے مان رہے ہیں تو انہوں نے کیا جواب دیا۔ اسے ذرا غور سے پڑھئیے۔ فرماتے ہیں:-

> اب غور فرمائیے۔ یہ ہیں وہ ماخذ جن سے میں نے اپنی بحث میں سارا مواد لیا ہے۔ اگر یہ اس دور کی تاریخ کے معاملہ میں قابل اعتماد نہیں ہیں تو پھر اعلان کر دیجئے کہ عہدِ رسالت سے لے کر آٹھویں صدی تک کی کوئی اسلامی تاریخ دنیا میں موجود نہیں ہے کیونکہ عہدِ رسالت کے بعد سے کئی صدیوں تک کی پوری اسلامی تاریخ بشمول شیخین کی تاریخ سمیت، انہی ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے۔ اگر یہ قابل اعتماد نہیں تو ان کی بیان کی ہوئی خلافت راشدہ کی تاریخ اور ائمہ اسلام کی سیرتیں اور ان کے کارنامے سب اکاذیب کے دفتر ہیں جنہیں ہم کسی کے سامنے وثوق کے ساتھ پیش نہیں کر سکتے۔ دنیا کبھی اس اصول کو نہیں مان سکتی۔ اور دنیا کیا، خود مسلمانوں کی موجودہ نسلیں بھی اس بات کو ہرگز قبول نہ کریں گی کہ ہمارے بزرگوں کی جو خوبیاں یہ تاریخیں بیان کرتی ہیں وہ تو سب صحیح ہیں، مگر جو کمزوریاں یہی کتابیں پیش کرتی ہیں وہ سب غلط ہیں۔
>
> (خلافت وملوکیت ص۳۱۶)

آپ نے غور فرمایا کہ بات کیا ہوئی؟ — یہ کہ جب مودودی صاحب کے خلاف کسی نے یہ اعتراض کیا کہ آپ نے فلاں حدیث کو رد کیوں کر دیا حالانکہ وہ بخاری میں درج ہے تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ بخاری

(یا دیگر کتب روایات) ایسی تھوڑی ہیں کہ انہیں پورے کا پورا صحیح مان لیا جائے۔ انہیں جانچنا پرکھنا چاہیئے۔ جو بات صحیح ہو اسے قبول کر لینا چاہیئے جو غلط ہو اسے مسترد کر دینا چاہیئے۔

اور جب ان سے کہا گیا کہ صاحب! آپ نے ان کتب تاریخ کی اس قسم کی روایات کو کیوں صحیح تسلیم کر لیا جن سے رسول اللہ اور صحابہ کبارؓ کی سیرت (معاذ اللہ) داغدار ہو کر سامنے آتی ہے' تو انہوں نے فرمایا کہ واہ! یہ بھی کوئی اصول ہے کہ ان کتابوں میں جو باتیں رسول اللہ یا صحابہؓ کی خوبیاں بیان کرتی ہوں انہیں لے لیا جائے اور جن سے ان کی کمزوریاں سامنے آتی ہیں انہیں مسترد کر دیا جائے۔ آپ کی اس روش کو دنیا میں کون معقول قرار دے گا؟

یہ ہیں مودودی صاحب' اور یہ ہے ان کی پیش کردہ دلیلوں کی کیفیت۔

اس سلسلہ میں ہم مودودی صاحب سے ایک بات پوچھنا چاہتے ہیں۔ دو سال ادھر کی بات ہے کہ ان سے کسی نے پوچھا کہ بخاری میں جو حدیث ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ایک رات میں اپنی نوے بیویوں سے مباشرت کی' آپ نے اس کی سند کو درست تسلیم کرنے کے باوجود' اس حدیث کو غلط قرار دیا ہے۔ تو یہ کس طرح روا ہے۔ اس کا جواب مودودی صاحب نے ترجمان القرآن کی مارچ ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں یہ دیا تھا کہ بے شک سند کے اعتبار سے یہ حدیث صحیح ہے لیکن جب ہم اسے عقل و بصیرت کی بنا پر پرکھتے ہیں تو یہ قابلِ قبول نہیں قرار پاتی۔

ہم مودودی صاحب سے اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی غیر مسلم' یا مسلمانوں کی موجودہ نسل کا نوجوان آپ سے یہ کہے کہ کیوں صاحب! یہ کہاں کی معقولیت ہے کہ بخاری شریف میں حضرت سلیمانؑ کی جو خوبیاں بیان کی گئی ہیں ۔۔۔ یا ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جو آپ کے نزدیک معقول ہیں ۔۔۔ انہیں تو صحیح مان لیا جائے اور جو بات ان کے خلاف جاتی ہے اسے مسترد کر دیا جائے۔ اگر ماننا ہے تو سب باتوں کو صحیح مانئے اگر مسترد کرنا ہے تو سب کو مسترد کر دیجئے ۔۔۔ تو فرمائیے آپ کے پاس اس اعتراض کا کیا جواب ہے؟

مودودی صاحب کے پاس تو معلوم نہیں کہ اس اعتراض کا جواب کیا ہو' لیکن ایک مسلمان کے نزدیک جس کا قرآنِ کریم پر ایمان ہے' اس کا جواب صاف اور واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ ہماری حیثیت' باقی دنیا کے مقابلہ میں ایک گونہ منفرد ہے۔ قرآن پر ہمارا ایمان ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن میں لکھا ہے ہم اسے حرفاً حرفاً صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی بات کسی جگہ ایسی ملتی ہے جو قرآن کریم میں بیان کردہ کسی واقعہ کے خلاف ہے تو ہم اس بات کو کبھی صحیح تسلیم نہیں کر سکتے۔ مثلاً قرآن کریم میں حضرت یوسفؑ کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے عزیزِ مصر کی بیوی کے اصرار کے باوجود' اپنی عصمت کو برقرار رکھا۔ اب اگر کوئی تاریخ حضرت

یوسفؑ کے بے شمار محاسن بیان کرنے کے ساتھ یہ کہے کہ انہوں نے عزیز مصر کی بیوی پر ہاتھ ڈالا تھا تو ہم ان محاسن کو تو صحیح تسلیم کر لیں گے لیکن ان کی طرف منسوب کردہ دست درازی کو کبھی صحیح تسلیم نہیں کریں گے اس پر اگر دنیا کے مؤرخ ہمیں کہیں کہ آپ کی یہ روش نہایت غیر علمی ہے کہ آپ تاریخ کے ایک حصہ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں لیکن اسی کے دوسرے حصے سے انکار کرتے ہیں، تو ہم اس سے کہیں گے کہ تاریخ کو پرکھنے کا ہمارا معیار آپ سے مختلف ہے۔ ہم تاریخ کے کسی ایسے بیان کو صحیح تسلیم نہیں کر سکتے جو قرآنی تصریحات سے ٹکراتا ہو بے شک ہمارا فریضہ یہ ہوگا کہ ہم تاریخی تحقیق سے یہ ثابت کریں کہ قرآن کی تصریح حقیقت پر مبنی ہے لیکن جب تک ایسا نہ ہو سکے، ہم قرآنی تصریح کو غلط نہیں قرار دیں گے۔ ایک غیر مسلم کی تو یہ روش ہو سکتی ہے کہ وہ قرآن کریم کی جن تصریحات کو جی چاہے صحیح تسلیم کرے اور جنہیں چاہے مسترد قرار دے دے۔ لیکن قرآن پر ایمان رکھنے والے کی یہ پوزیشن نہیں ہو سکتی۔ اسے قرآن کے ایک ایک لفظ کو مبنی بر حقیقت تسلیم کرنا ہوگا۔ لیکن اگر اس کے نزدیک قرآن کی بعض باتیں ایسی ہیں جن کے مبنی بر حقیقت ہونے میں شبہ ہے، تو اسے قرآن پر ایمان رکھنے کا دعوےٰ نہیں کرنا چاہیئے۔ اس کی حیثیت ایک غیر مسلم کی ہوگی۔

قرآن کریم میں صحابہ رسول اللہ کی سیرت و کردار کے متعلق ایسے واضح الفاظ میں تصریحات آئی ہیں جن میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔ سورۃ انفال میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ (۸/۷۴)

اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی۔ اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے انہیں پناہ دی۔ اور ان کی مدد کی۔ یہ سب سچے اور پکے مؤمن ہیں۔ ان کے لئے مغفرت اور رزقِ کریم ہے۔

اس کے بعد ہے :۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ۭ .... (۸/۷۵)

اور جو لوگ ان کے بعد ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ ملکر جہاد کیا۔ وہ بھی تم میں سے ہی ہیں۔

سورۃ توبہ میں ہے :۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۹/۱۰۰)

اور مہاجرین اور انصار میں سے جنہوں نے سبقت کی، اور جنہوں نے حسن کارانہ انداز سے ان کا اتباع کیا۔ ان سب سے خدا راضی ہو گیا اور وہ خدا سے راضی ہو گئے۔ ان کے لئے خدا نے (جنت کے) باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی فیروز مندی ہے۔

سورۃ حدید میں کہا گیا ہے کہ جن مومنین نے فتح (مکہ) سے پہلے دین کی خاطر قربانیاں دیں، ان کے درجات عظیم ہیں بمقابلہ ان کے جو فتح کے بعد ان کے ساتھ شامل ہوئے۔ یہ ان کے مدارج کا باہمی تقابل ہے لیکن كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى۔ (۵۷/۱۰) خدا نے ان سب سے اچھے وعدے کر رکھے ہیں۔ سورۃ فتح میں ــــ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (۴۸/۲۹) ــــ کہہ کر جن وجد انگیز الفاظ میں ان حضرات کی تعریف کی گئی ہے وہ ہر قرآن پڑھنے والے کے سامنے ہے۔ یہی رسول اللہ کے وہ رفقاء (والذین معہ) تھے جن کے متعلق خدا نے کہا تھا کہ

هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۸/۶۲)

اللہ وہ ہے جس نے (اے رسولؐ!) اپنی نصرت سے، اور جماعت مومنین کے ذریعے تیری تقویت کا سامان بہم پہنچایا۔

اور اسی لئے ــــ

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۸/۶۴)

اے نبی! تیرے لئے خدا، اور تیرے پیروکار مومنین کی جماعت کافی ہے۔

یہ تھی وہ متاعِ گراں بہا جس کی اہمیت بیان کرنے کے لئے کہا گیا تھا کہ ــــ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ ــــ (۶/۵۲) یہ لوگ جو صبح، شام، مسلسل، اپنے رب کو پکارتے ہیں اور اس میں ان کے ذاتی مفاد یا نفسانی خواہشات کا کوئی دخل نہیں ہوتا یہ خالصۃً لوجہ اللہ ایسا کرتے ہیں، دیکھنا! انہیں اپنے سے دور نہ کر دینا۔ اگر ایسا کرو گے تو یہ بہت بڑا ظلم ہوگا۔

ہم نے اس مقام پر صرف چند ایک آیاتِ قرآنی کو درج کیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے مومنین کی جن خصوصیات اور صفاتِ حسنہ کا تذکرہ کیا ہے ان کے اولین حامل اسی جماعت کے افراد تھے جو

رسول اللہ کے دستِ مبارک پر ایمان لاتے تھے اور جنہیں قرآن نے خَیْرَ اُمَّۃٍ (بہترین جماعت) کہہ کر پکارا ہے۔ (اس کی تفصیل کے لئے ایک مستقل تصنیف درکار ہوگی)۔ اسلامی تعلیم اور تربیت نبوی کی صداقت کا زندہ ثبوت انہی حضرات کی جماعت تھی۔ انہی پر خدا اور اس کے فرشتے، درود بھیجا کرتے تھے۔ (۳۳/۴۳)

قرآن کریم کی ان تصریحات سے واضح ہے کہ جو لوگ ـــــ

(۱) رسول اللہ کے زمانے میں ایمان لے آئے۔

(۲) انہوں نے ہجرت کی۔

(۳) مہاجرین کو پناہ دی

(۴) جہاد کیا ـــــ خواہ اس کے اصطلاحی معنوں میں شریک جنگ ہوئے یا عام مفہوم میں رسول اللہ کی معیت میں قیام و استحکام دین کے لئے جدوجہد کی۔

یہ سب کے سب ـــــ

ا۔ سچے اور پکے مومن تھے۔

ب۔ خدا ان سے راضی ہوگیا تھا۔

ج۔ ان کے لئے جنت کا وعدہ تھا۔

د۔ یہ رسول اللہ کے لئے باعثِ تقویت تھے۔

ر۔ ان کی رفاقت حضورؐ کے لئے (خدا کی مدد کے ساتھ) کافی تھی۔

س۔ خدا اور اس کے فرشتے ان پر صلوٰۃ و سلام کے پھول نچھاور کرتے تھے۔

اب ظاہر ہے کہ جو حضرات بھی اس زمرہ میں شامل تھے، ان کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کرنا جو مومنین کی خصوصیات کے خلاف ہو، قرآن کریم کی صریح مخالفت ہے ـــــ وہ ابوبکرؓ و عمرؓ ہوں یا عثمانؓ و علیؓ۔ وہ معاویہؓ ہوں یا ابوذر غفاریؓ۔ وہ عمرو بن عاصؓ ہوں یا سعد بن وقاصؓ (رضی اللہ تعالےٰ عنہم اجمعین) ـــــ وہ کوئی بھی ہو ـــــ جو اس زمرہ میں شامل ہے، وہ قرآن کی شہادت کے مطابق مومن حقا ہے۔ انہی کو صحابۂ رسول اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ سب کے سب پکے اور سچے مومن تھے۔ ان حضرات کے متعلق تاریخ میں جو باتیں ایسی ہیں جو مومنین کے معیار پر پوری اُترتی ہیں۔ انہیں ہم صحیح تسلیم کریں گے۔ اس لئے کہ وہ باتیں قرآن کی شہادت کے مطابق ہیں۔ جو اس کے خلاف ہیں انہیں ہم مسترد قرار دیں گے۔ خواہ غیر مسلم (مودودی صاحب کی طرح) یہی کیوں نہ کہیں کہ یہ روش غیر تاریخی ہے۔ ہم ان سے یہی کہیں گے کہ یہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے جو انسانوں کے بناتے ہوئے اصولوں سے بہرحال بلند ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں منافقین بھی تو تھے جو مسلمانوں کے لباس میں جماعت میں شامل ہو گئے تھے ۔ یہ ٹھیک ہے ۔ لیکن قرآن کریم نے اس کی بھی وضاحت کر دی تھی کہ وہ جماعت مومنین کو اس حالت میں نہیں چھوڑے گا کہ خبیث وطیب اسی طرح ملے جُلے رہیں کہ ان کی تفریق وتمیز ہی نہ ہو سکے ــــ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۔ (۳/۱۷۹) خدا کے اس حتمی پروگرام کے مطابق ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ رسول اللہ کی وفات سے پہلے منافقین اس جماعت سے چھٹ کر الگ ہو چکے تھے اور جو لوگ اس جماعت کے ساتھ تھے وہ مخلص مومن تھے ۔ ان میں کوئی بھی منافق نہیں تھا ۔

لیکن اگر کوئی شخص اسے تسلیم نہیں کرتا تو اسے چاہیئے کہ ایسے "منافقین" کی ایک فہرست مرتب کرے جو آخر تک جماعت مومنین کے اندر رہے تھے ، تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ وہ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ ، میں سے کسے مومن اور کسے (معاذ اللہ) منافق سمجھتا ہے ۔ ہم مودودی صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ حضرت عثمانؓ ، حضرت معاویہؓ ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ یا حضرت عمرو بن عاصؓ (وغیرہم) کو (معاذ اللہ) منافقین کے زمرے میں شمار کرتے ہیں ؟

اگر یہ کہا جائے کہ وہ لوگ رسول اللہ کی زندگی میں تو مومن ہی تھے ، بعد میں دین سے پھر گئے تھے تو یہ بات قرآن کی شہادت کے خلاف ہے ۔ خدا نے جب ان کے لئے جنت کا وعدہ دے دیا تو اس کے معنی یہی ہیں کہ یہ حضرات عمر بھر مومن صادق رہے تھے ـــ کیا اسے باور کیا جا سکتا ہے کہ ایک شخص آج مومن ہو اور خدا اسے جنت کا وعدہ دیدے ۔ اور اس کے بعد وہ دین سے پھر جائے ۔ اس کا تو یہ مطلب ہوگا کہ وہ (معاذ اللہ) خدا کو فریب دے کر جنت کا وعدہ لے گیا ـــ کیا خدا ایسے لوگوں کو جنت کا وعدہ دیا کرتا ہے جو آج مومن ہوں اور کل کو دین سے پھر جائیں ؟ جنت کا حقدار تو وہی ہوتا ہے جو ایمان لانے کے بعد عمر بھر مومن رہے ۔ (فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ــ (۳/۱۰۲) خدا نے جنت کا وعدہ انہی سے کیا تھا جن کے متعلق اسے معلوم تھا کہ وہ ساری عمر دین پر قائم رہیں گے ۔

مودودی صاحب بار بار لکھتے ہیں کہ یہ حضرات مومن تو تھے لیکن معصوم نہیں تھے ۔ اس لئے ان سے سہو وخطا کا امکان تھا ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان حضرات سے سہو وخطا کا امکان تھا ۔ اس باب میں قرآن نے خود وضاحت کر دی ہے جب کہا ہے کہ مومنین کا شعار زندگی یہ ہے کہ ـــ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۔ (۵۳/۳۲) ــ جو کبائر اثم اور فواحش سے بچتے ہیں ۔ بجز لمم کے ۔ لمم کے معنے ہیں بلا ارادہ ، یوں ہی کبھی کبھار کسی ناپسندیدہ حرکت کا سرزد ہو جانا ۔ اسی کو سہو وخطا کہتے ہیں ـــ

سوال یہ ہے کہ مودودی صاحب نے ان صحابہ کبار رضہ کی طرف جن افعال کو منسوب کیا ہے۔ وہ کبائر الاثم والفواحش کے زمرے میں آتے ہیں یا قسم کے؟ وہ حضرت عثمان رضہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ

۱۔ انہوں نے خلافت کو ملوکیت سے بدلنے کی ابتدا کا آغاز کیا۔

(۲) وہ رسول اللہ اور حضرت ابوبکر رضہ و حضرت عمر رضہ کی پالیسی سے ہٹتے چلے گئے۔ انہوں نے پے در پے اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے اہم عہدے عطا کئے اور ان کے ساتھ دوسری ایسی رعایات کیں جو عام طور پر لوگوں میں ہدفِ اعتراض بن کر رہیں۔

کیا یہ سہو و خطا کی بنا پر معمولی لغزشیں ہیں یا نظامِ اسلامی کو اس کی اصل و بنیاد سے اکھیڑنے کی پالیسی جس پر وہ اپنی مدت خلافت میں التزاماً قائم رہے؟

پھر انہی (حضرت عثمان رضہ) نے ولید بن عقبہ رضہ کو کوفہ کا گورنر مقرر کر دیا۔

جو شراب نوشی کے عادی تھے۔ حتیٰ کہ نماز بھی بہ حالتِ نشہ پڑھا یا کرتے تھے۔

کیا کسی کا عادی شرابی ہونا، سہو و خطا میں داخل ہے؟

حضرت معاویہ رضہ کے خلاف انہوں نے جو فہرست جرائم مرتب کی ہے۔ وہ بڑی طول طویل ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ :-

۱۔ انہوں نے خلیفۂ راشد حضرت علی رضہ کے خلاف بغاوت کی۔

۲۔ انہوں نے بزورِ شمشیر، امت کی رضامندی کے خلاف، حکومت حاصل کی اور اسے بزورِ شمشیر قائم رکھا۔ (پھر تمام صحابہ رضہ نے، اس طرح خلیفہ بن جانے والے کی خلافت کو برحق تسلیم کر لیا)

۳۔ وہ مالِ غنیمت میں خیانت کیا کرتے تھے۔

۴۔ وہ سنتِ رسول اللہ کی خلاف ورزی کیا کرتے تھے۔

۵۔ انہوں نے سیاست کو دین پر بالا رکھا اور دین کی بنیاد کو منہدم کر دیا۔

کیا یہ سہو و خطا ہے؟ لیکن دیکھئے۔ یہ کچھ کہنے کے بعد، مودودی صاحب فرماتے کیا ہیں؟ لکھتے ہیں:-

> حضرت معاویہ رضہ کے محامد و مناقب اپنی جگہ پر ہیں۔ ان کا شرفِ صحابیت بھی واجب الاحترام ہے۔ ان کی یہ خدمت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ انہوں نے پھر سے دنیائے اسلام کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا، اور دنیا میں اسلام کے غلبے کا دائرہ زیادہ وسیع کر دیا۔ ان پر جو لعن طعن کرتا ہے وہ بلاشبہ زیادتی کرتا ہے۔ لیکن ان کے غلط کام کو تو غلط کہنا ہی ہوگا۔
>
> (ص ۱۵۲)

غور کیجئے کہ یہ کتنی بڑی تلبیسانہ چال ہے؟ سوال یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے متعلق جو کچھ آنجناب نے لکھا ہے، کیا اس کے بعد، لوگ ان پر (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) لعن طعن کریں گے یا درود و سلامؓ بھیجیں گے؟ لوگوں کو چھوڑیئے۔ ہم خود انہی سے پوچھتے ہیں کہ جس شخص کا کردار وہ ہو جو انہوں نے (حضرت) معاویہؓ کا بیان کیا ہے، کیا اس قسم کی سیرت و کردار کا حامل، خود ان کے نزدیک مورد لعن طعن ہوگا یا مستحق ستائش؟

حضرت عمرو بن عاصؓ کے متعلق مودودی صاحب نے (ولایت یزید کے سلسلہ میں) جس سازش کا ذکر کیا ہے کیا اسے سہو و خطا سے تعبیر کیا جائے گا۔ اور جن حضرات نے تیس ہزار درہم لے کر، دین فروشی کی تھی، کیا اسے بھی ان کی نادانستہ خطا کہا جائے گا۔

اور آخر میں یہ کہ جس فوج نے مدینہ طیبہ میں (پناہ بخدا) ایک ہزار مسلم خواتین کو زنا سے حاملہ کیا تھا، اور جو بزرگ اسے چپ بیٹھے دیکھتے رہے تھے، کیا ان کے ان افعال کو سہو و خطا سے تعبیر کیا جائیگا؟

یہ ہیں مودودی صاحب، جو اقامت دین اور احیاء اسلام کے پردے میں، اسلام کے خلاف اس قسم کی سازشوں میں مصروف ہیں۔ ہم نے باطنی تحریک کے کوائف "تاریخ" میں پڑھے تھے کہ وہ لوگ کس طرح زہد و اتقا کے لبادوں میں، اسلام کو تباہ و برباد کرنے میں مصروف سعی و عمل رہتے تھے اور ان کی فریب کاریاں کس طرح سادہ لوح مسلمانوں کو دین سے برگشتہ کر دیتی تھیں۔ آج پھر وہی تاریخ ہمارے سامنے ہے اور عصر حاضر کے یہ "حسن بن صباح" پھر اسی تخریب میں مصروف۔ ان کے حصولِ حکومت کے مواعید، "قلعہ الموت کی جنت کا بدل، اور سیٹیج کے زہر بھرا پیگنڈہ، وہ برگ ہائے حشیش ہیں جن سے عوام کی عقل و ہوش کو مفلوج کر کے یہ لوگ اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ روح وہی ہے بس پیکر بدل گئے ہیں۔ ؎

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

اس قسم کی اسلام کش سازشوں کا علاج صرف یہ ہے کہ عہد محمد رسول اللہ والذین معہٗ کی تاریخ کو از سرِ نو مرتب کیا جائے اور اس میں غلط اور صحیح کا معیار قرآن کریم کو قرار دیا جائے۔ اس کے بعد اس کا اعلان کر دیا جائے کہ اس کے علاوہ، ہماری کوئی تاریخ قابلِ اعتماد نہیں۔ — ولو کرہ المشرکون — اگر ایسا نہ کیا گیا تو جس خطۂ زمین میں بھی اسلام کی برومندی کے امکانات نظر آئیں گے اس قسم کی باطنی تحریکیں پیدا ہوتی چلی جائیں گی اور ہر آنے والی تحریک کا سہارا، اس قسم کی گڑھی ہوئی تحریک کی مرتب کردہ تاریخ ہوگی

غور کیجئے کہ جب قوم کے نوجوانوں کے ہاتھ میں یہ دلیل دے دی جاتی ہے کہ یہ روش تو بڑی غیر معقول ہے کہ تاریخ میں جیسی جو باتیں ایسی ملیں جو نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی خوبیاں بیان کرتی ہوں' انہیں صحیح تسلیم کر لیا جائے اور جن باتوں سے ان کی کمزوریاں سامنے آئیں انہیں غلط قرار دے دیا جائے' تو اس کے بعد ان نوجوانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے کسی اور حربے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے! یہ ہے وہ ٹیکنیک جو شروع سے استعمال ہوتی چلی آرہی ہے اور آج بھی اسی طرح استعمال کی جارہی ہے۔ یاد رکھئے۔ یہ خطرہ کوئی معمولی خطرہ نہیں۔ اس کے عواقب بڑے دور رس ہیں۔ یاد رکھئے۔ یہ لوگ جو تاریخ کو ایک مقدس دیوتا بنا رکھتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ ان کے نزدیک فی الواقعہ تاریخ کی عظمت اس قدر ہے۔ یہ ایسا محض اس لئے کرتے ہیں کہ اس سے ان کے اپنے بہت سے کام نکلتے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ ایک شخص اپنے ہر فیصلہ اور اقدام کے لئے قرآن کو سند اور حجت قرار دیتا ہے تو اس سے وہ اپنے اوپر کس قدر غیر متبدل پابندیاں عاید کر لیتا ہے۔ اس کے ہر قول و فعل کو ہر وقت پرکھا اور چیلنج کیا جا سکتا ہے اور اس سے اسے کوئی مفر نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو شخص تاریخ کو حجت قرار دیتا ہے وہ اپنے لئے گریز اور فرار کی ہزار راہیں تیار رکھتا ہے۔ تاریخ میں آپ کو آپ کے ہر قول اور ہر عمل کے لئے کوئی نہ کوئی سند مل سکتی ہے کیونکہ اس میں رطب و یابس سب کچھ بھرا ہوا ہے۔ مودودی صاحب جو نت نئے دن گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے رہتے ہیں تو اس کی ساری سندیں انہیں تاریخ سے مل جاتی ہیں۔ قرآن کو سند اور حجت ماننے والا تو ساری عمر میں دو متضاد باتیں قرآن کی سند سے نہیں کہہ سکتا۔ قرآن کریم نے اس باب میں ہمارے لئے نہایت صاف اور واضح راہ متعین کر دی ہے۔ اس نے ہماری تاریخ کے صدر اول (محمد رسول اللہ والذین معہ) کا اہم حصہ خود اپنے دامن میں محفوظ کر رکھا ہے۔ اس پر ہمارا ایمان ہے۔ ان کے بعد کی تاریخ کے متعلق اس نے دو ٹوک فیصلہ کر دیا ہے کہ تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت و لکم ما کسبتم۔ ولا تسئلون عما کانوا یعملون۔ (۲/۱۳۴) یہ لوگ اپنے وقت میں دنیا سے چلے گئے۔ ان کے اعمال ان کے ساتھ، تمہارے اعمال تمہارے ساتھ۔ تم سے پوچھا ہی نہیں جائے گا کہ ان لوگوں نے کس قسم کے کام کئے تھے۔

جب تک دین اور تاریخ کے متعلق یہ پوزیشن آپ کے ذہن میں اچھی طرح راسخ نہیں ہوگی' آپ ان الجھنوں سے نکل نہیں سکیں گے جو تاریخ کے متعلق غلط تصورات نے صدیوں سے ہمارے ہاں پیدا کر رکھے ہیں۔ اور جو اس راستے سے خود ہمارے دین پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہم اسلام کو اپنی تاریخ سے مرتب کرتے ہیں حالانکہ ہماری تاریخ' اسلام سے مرتب ہونی چاہیئے۔

نقد و نظر

۱۔ تبصرۂ محمودی بر ہفوات مودودی

مودودی صاحب نے اپنی کتاب "خلافت و ملوکیت" میں (جس کا تعارف گزشتہ صفحات میں کرایا گیا ہے) یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ جن کتب تاریخ سے انہوں نے یہ مواد لیا ہے وہ بڑی قابلِ اعتماد ہیں۔ اور ان سے اقتباسات دینے میں انہوں نے بڑی دیانت سے کام لیا ہے۔

ہماری کتب تاریخ و روایات کی مؤرخانہ حیثیت کیا ہے؟ اس اہم علمی سوال کا نہایت محققانہ انداز سے جواب دینے کی اہل، ہماری نگاہ میں، پاکستان میں، دو ہستیاں ہیں۔ ایک علامہ تمنا عمادی[1] اور دوسرے محترم محمود عباسی صاحب۔ تاریخ اسلام پر ان کی نگاہ بڑی گہری اور اسماء الرجال میں ان کا درک بڑا محققانہ ہے محترم عباسی صاحب نے مودودی صاحب کی کتاب کا تنقیدی نگاہ سے جائزہ لے کر نہایت واشگاف الفاظ میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ جن تاریخی روایات کا ان صاحب نے سہارا لیا ہے ان کی پوزیشن کیا ہے اور ان سے اخذِ مطالب میں انہوں نے کس حد تک دیانت سے کام لیا ہے۔ ان کی کتاب (تبصرۂ محمودی بر ہفوات مودودی — جو دو حصوں میں شائع ہوئی ہے) بڑی محنت اور کاوش سے مرتب کی گئی ہے اور اس فتنہ کا مسکت جواب ہے جسے مودودی صاحب پھیلانا چاہتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ عباسی صاحب کی اس کتاب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے۔ حصہ اول کی قیمت تین روپے ۲۵ پیسے ہے اور حصہ دوم کی قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ علم و حکمت۔ موتی مندی۔ لاہور۔ (یا مکتبہ محمود ۲۲/۱ بی ایریا۔ لیاقت آباد۔ کراچی ۱۹)

---

[1] ہماری تاریخ کا اولین ماخذ طبری کی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ کس حد تک قابلِ اعتماد ہے اس کے متعلق علامہ تمنا عمادی مجیبی کا ایک تحقیقی مقالہ اسی اشاعت میں شائع ہو رہا ہے۔

۲۔ بادشاہ بیگم اودھ

اس کتاب کا سرنامہ دیکھ کر ہم نے جی میں کہا کہ اس زمانے میں، اودھ کی بادشاہ بیگم کے تذکرے کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے ، لیکن جب کتاب کو پڑھا تو اس میں ایسی ایسی باتیں سامنے آئیں جو نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ بڑی معلومات افزا۔

منشی عبد الاحد رابطہ نے، جو میرزا نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کے زمانہ میں، لکھنو ریذیڈنسی میں سرشتہ دار تھے۔ شاہانِ اودھ کی محلاتی زندگی کے متعلق، فارسی زبان میں ایک کتاب لکھی جس کا نام "وقائع دلپذیر" تھا۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ، محمد تقی صاحب نے ۱۹۳۷ء میں "تاریخ بادشاہ بیگم" کے نام سے شائع کیا۔ اب اس کا اردو ترجمہ، محترم محمود عباسی صاحب نے، اپنے محققانہ مقدمہ کے ساتھ (جو قریب ڈیڑھ سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے) شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں اچھوتیوں (یعنی ائمہ کی فرضی بیویوں) کے واقعات، بادشاہ کا فرضی اماموں کو جننا، زچہ بننا، چھٹی نہانا، زنانہ لباس میں جلوس نکالنا۔ اور دیگر اس قسم کے کوائف درج ہیں جنہیں پڑھ کر انسان ورطۂ حیرت میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے کہ جسم ہندوستان میں اس قدر ذلیل و خوار اور تباہ و برباد کیوں ہوئے تھے۔ کتاب کے مقدمہ سے یہ امر بھی ہویدا ہو جاتا ہے کہ عباسی صاحب کی نگہِ ژرف بیں صرف متقدمین کی تاریخ پر ہی حاوی نہیں، متاخرین کی تاریخ پر بھی ان کی نگاہ اتنی ہی دور رس اور ان کا مطالعہ ایسا ہی وسیع ہے۔ اس کتاب کی قیمت ۳ روپے آٹھ آنے ہے اور ملنے کا پتہ وہی جو (تبصرۂ محمودی کے سلسلہ میں) دیا گیا ہے۔

۳۔ صحابۂ رسولؐ کی افسانوی جنگیں

۱۶ صفحات کے اس مختصر سے پمفلٹ میں یہ بتایا گیا کہ تاریخ میں، صحابہ کرامؓ کی باہمی جنگوں (جنگ جمل اور صفین وغیرہ) کے جو قصے مذکور ہیں وہ سب افسانے ہیں۔ صحابہؓ، جن کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ وہ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ کے مظہر تھے، کبھی ایک دوسرے کے خلاف تلوار نہیں اٹھا سکتے تھے ۔۔۔ یہ پمفلٹ (۷) پیسے کے ٹکٹ بھیجنے پر حسب ذیل پتہ سے مفت حاصل کیا جا سکتا ہے ۔۔۔

تبلیغی مرکز۔ ریلوے روڈ۔ لاہور

یا ڈاکٹر حسین الدین۔ شفاء للناس۔ لنک روڈ۔ چوک شالیمار۔ لاہور

۴۔ تاریخ طبری (حصہ اول)

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت ہم اپنی تاریخ کے سلسلہ میں یہ کچھ لکھ رہے تھے۔ اور مورخ طبری کے متعلق علامہ تمنا عمادی کا مقالہ شائع کر رہے تھے تو ہمیں، نفیس اکادمی۔ بلاسس اسٹریٹ، کراچی کی طرف سے تاریخ طبری (حصہ اول) کا نسخہ تبصرہ کے لئے موصول ہوا

تاریخ طبری کا اردو ترجمہ مدت ہوئی، حیدرآباد (دکن)، سے شائع ہوا تھا جو اب نایاب تھا۔ نفیس اکیڈمی نے اس ترجمہ کی دوبارہ اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ اس کا حصہ اول، جو سیرتِ رسول اللہؐ پر مشتمل ہے، مارکیٹ میں آگیا ہے۔ (جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں) "تاریخ طبری" مسلمانوں کی سب سے پہلی مرتب تاریخ ہے۔ اس لئے اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں ہو سکتا بشرطیکہ اسے (یا کسی اور تاریخ کو) پڑھتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ تاریخ کی کوئی کتاب بھی کلام اللہ نہیں ہوتی۔ اس میں صحیح واقعات بھی ہوتے ہیں اور غلط بھی۔ غلط اور صحیح میں امتیاز ہمیں خود کرنا چاہیئے جہاں تک عہدِ رسالتمآبؐ اور صحابہ کبارؓ کا تعلق ہے اس کا معیار یہ ہے کہ تاریخ میں جو باتیں ایسی ہیں جن سے ان کی سیرت پر کسی قسم کا حرف آتا ہے، وہ صحیح نہیں ہیں۔ اس لئے کہ قرآن کریم ان کی پاکیزگی، سیرت وبلندی کردار کی شہادت دیتا ہے۔ کتاب بڑی تقطیع کے قریب ساڑھے پانسو صفحات پر مشتمل ہے۔ سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے اور مجلد کی قیمت سولہ روپے ہے۔

۵۔ تحریک ریشمی رومال

ہندوستان میں بیسویں صدی کے آغاز میں، انگریزوں کی غلامی سے رستگاری حاصل کرنے کیلئے جو مختلف تحریکیں رونما ہوئیں، ان میں ایک تحریک وہ بھی تھی جو "ریشمی رومال" کے نام سے مشہور ہے۔ اس تحریک کے بانی (مولانا) محمود الحسن مرحوم (دیوبندی) تھے اور اسکیم یہ تھی کہ ترکی حکومت، افغانستان کے راستے، ہندوستان پر حملہ کر دے۔ اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے مختلف مقامات سے بغاوت کی آگ بھڑکا دی جائے۔ اس اسکیم سے متعلق ایک خفیہ دستاویز، ایک ریشمی رومال میں بُن کر افغانستان سے ہندوستان بھیجی گئی تھی تاکہ اسے (مولانا) محمود الحسن صاحب تک مدینہ منورہ میں پہنچا دیا جائے۔ یہ رومال ہندوستان میں پکڑا گیا اور یوں یہ ساری اسکیم ناکام رہ گئی۔ (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) نے اس تحریک کے سرگزشت حالات مرتب کئے تھے اور اس کے شروع میں یہ بھی بتایا تھا کہ انگریزوں نے ہندوستان

ہیں کیا کیا مظالم کئے اور کس طرح سیاسی، معاشی اور اخلاقی طور پر مسلمانوں کو دیوالیہ بنا دیا۔ اب اسے' (مولانا) عبدالرحمٰن صاحب نے ترتیب جدید کے ساتھ مدون کیا ہے اور مکتبہ کلاسیک (ریلوے ۔ دی مال ۔ لاہور) نے شائع کیا ہے۔ قسم اول کی قیمت پانچ روپے اور قسم دوم کی ساڑھے تین روپے ہے۔ اس کتاب کے مشمولات سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ جن حضرات نے آزادی کی یہ تحریکیں اٹھائیں ان کی حسن نیت اور صدق خلوص میں شبہ نہیں تھا لیکن ان تحریکوں کے ساتھ نہ کوئی پلاننگ تھی نہ بساطِ سیاست کی بصیرت۔ بس جذبات ہی جذبات تھے ۔۔۔ لہٰذا سیاسی تفقہ سے خالی جذبات کا جو حشر ہوا کرتا ہے وہی حشر ان تحریکوں کا ہوا حسن نیت کے ساتھ سیاسی بصیرت لئے ہوئے یہاں ایک ہی تحریک اٹھی ۔۔۔ اور وہ تھی قائداعظم کی تحریک پاکستان ۔۔۔ اور وہ اس طرح کامیاب ہوئی کہ قوم ایک قطرۂ خون بہائے بغیر آزادی سے ہمکنار ہو گئی۔

دوسری بات یہ سامنے آئی کہ اس تحریک میں بڑے بڑے جبّوں اور عماموں میں ملبوس 'علماء اور زہاد شریک تھے، جن کے لب پر خدا اور رسولؐ کا نام تھا لیکن جو درپردہ جاسوسی کرتے تھے۔ مرتب کتاب کے الفاظ میں "حضرت شیخ الہند کے رفقائے کار زیادہ تر علماء تھے اور آج سب سے زیادہ غیروں کے ہاتھ بکنے والی قوم یہی ہے۔" (ص ۲۹)

کتاب میں' (مولانا) مدنی مرحوم کے اندازِ بیان کی ژولیدگی موجود ہے۔ لیکن ہے یہ معلومات افزا۔ اس لئے پڑھنے کے قابل ہے۔

یومِ اقبالؒ

بزمِ لاہور' اسلام' یومِ اقبال کو اس کے شایانِ شان طریق سے منانے کی تجویز کر رہی ہے۔ اس قسم کی تقاریب' قرآنی فکر کے عام کرنے میں بڑی مفید ثابت ہوتی ہیں۔ ویسے بھی طلوعِ اسلام سے بڑھ کر فکرِ اقبالؒ کا شارح اور مبلغ کون ہو سکتا ہے۔ یہ تو پودا بھی انہی کے ہاتھ کا لگایا ہوا ہے۔

ناظم۔ ادارہ طلوعِ اسلام

طلوعِ اسلام کی کتابیں اور ماہنامہ طلوعِ اسلام

یہاں سے بھی مل سکتے ہیں

لاہور (۱) انٹرنیشنل بک سروس .. .. ۵۰ دی مال لاہور
(۲) کلاسیک بکسیلرز .. .. ۴۲ دی مال "
(۳) پیپلز پبلشنگ ہاؤس .. ۲۶ دی مال "
(۴) کواپریٹو بک شاپ .. .. ۷۰ دی مال "
(۵) لاہور بک ڈپو .. .. ۴۵ دی مال "
(۶) بک سنٹر .. چوک ریگل دی مال "
(۷) اوبستان .. .. چوک لکشمی "
(۸) آئیڈیل بک ہاؤس .. ۱۹۴ انارکلی "
(۹) مکتبۂ پاکستان .. چوک انارکلی "
(۱۰) گوشۂ ادب .. .. چوک انارکلی "
(۱۱) اسمٰعیل اینڈ برادرز .. چوک انارکلی "
(۱۲) نیشنل بک سٹال .. چوک انارکلی "
(۱۳) ماڈل بک سٹال .. ٹولنٹن مارکیٹ دی مال "
(۱۴) اور ینگا بک سٹال .. گلبرگ ۲ لاہور
(۱۵) پیپلز پبلشنگ ہاؤس۔
المنار مارکیٹ۔ چوک انارکلی۔ لاہور

لائل پور (۱) محمد احمد صاحب متعلم ایم اے گلی ۲
بلاک اے۔ نزد پرانی غلہ منڈی۔ ریل بازار۔
(۲) شریف سنز بکسیلرز۔ کارخانہ بازار۔ لائلپور۔
(۳) حافظ محمد یونس صاحب اے ۲۷۔ گلبرگ۔ لائلپور۔

کراچی (۱) محترم محمد اسلام صاحب (۱م-۱۰) لوئیس روڈ
نیو ٹاؤن۔ کراچی ۵ ۔ فون (۲۲۵۸۸۰)
(۲) ہر اتوار کی صبح ۹ بجے تا ۱۰ بجے
سندھ اسمبلی ہال۔ بندر روڈ۔
(۳) گلڈز انجمن کتاب گھر۔ وکٹوریہ روڈ۔ صدر
(۴) عوامی کتب خانہ۔ بولٹن مارکیٹ۔
(۵) شیخ شوکت علی اینڈ سنز۔ بندر روڈ۔ کراچی۔
(۶) جنرل بک ڈپو۔ فریئر روڈ۔
نزد حبیب بنک۔ کراچی۔
(۷) اقبال کتاب گھر۔ سمرسٹ اسٹریٹ۔
کراچی صدر۔

لیہ :- نقل ہوٹل۔ نزد ریلوے اسٹیشن
ہر جمعہ کو۔ بعد نماز عصر۔

انگلستان :- محترم رشید احمد بٹ صاحب۔
۱۴۰۔ سالٹ سٹریٹ۔ بریڈ فورڈ ۸

سرگودھا :- حکیم حسن محمد نظامی۔ نظامی دواخانہ
بلاک ۷۔ گلی مچھلی والی۔ سرگودھا۔

میانوالی :- صوفی عبدالرحمٰن صاحب جلد ساز
چوک فتح خان۔ ملک مظفر سٹریٹ۔ میانوالی۔

ملتان :- دانشکدہ حسین آگاہی۔

وطن کی بھلائی

اور

کنبے کی بھلائی

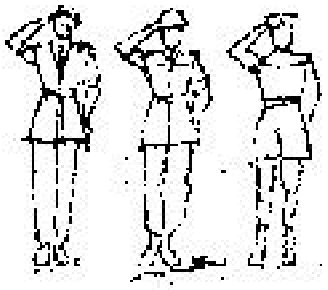

کیلئے

ڈیفنس سیونگز سرٹیفکیٹ

ڈیفنس سیونگز سرٹیفکیٹ میں سرمایہ لگانا ہمیشہ سے زیادہ منافع کمانے کا بہترین ذریعہ اور ملک کے دفاع میں ہاتھ بٹانے کا بے نظیر موقع ہے۔

ڈیفنس سیونگز سرٹیفکیٹ کی چند اہم خصوصیات

★ اگر آپ یہ سرٹیفکیٹ پانچ برس تک رکھیں تو منافع ۸ فیصد ملیگا اگر مزید پانچ برس رکھیں تو منافع ۸ فیصد ہو جائیگا یعنی ۸ فیصد منافع اور مزید ۲ فیصد بونس ۔ اس طرح صرف دس برس میں آپ کے ۱۰۰ روپیہ ۲۰۰ روپے بن جائیں گے۔

★ منافع اور بونس دونوں پر ٹیکس کی مکمل چھوٹ ہے۔ آپ کی لگائی ہوئی ابتدائی رقم پر بھی انکم ٹیکس کی رعایت دی جاتی ہے یعنی اتنی رقم آپ کی آمدنی میں سے منہا کر کے ٹیکس تشخیص کیا جاتا ہے

★ انفرادی طور پر ۲۵ ہزار روپے تک کے ڈیفنس سیونگز سرٹیفکیٹ خریدے جا سکتے ہیں اور مشترکہ طور پر ۵۰ ہزار روپے تک۔ ادارے اس سے زیادہ رقم بھی لگا سکتے ہیں اور ضابطے کے مطابق نامزدگیوں کی بھی اجازت ہے۔

★ پراویڈنٹ فنڈ سے بھی رقم لگائی جا سکتی ہے اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے۔

ڈیفنس سیونگز سرٹیفکیٹ

[illegible] ۵۰۰۰ روپے کی مالیتوں میں

ڈیفنس سیونگز سرٹیفکیٹ اسٹیٹ بینک آف پاکستان، منظور شدہ بینکوں اور ڈاکخانوں سے خریدے جا سکتے ہیں۔

تاریخِ طبری

(علامہ تمنّا عمادی مدظلہٗ العالی)

[علوم مذہبی سے واقف حضرات، نہ طبری کی تاریخ سے ناآشنا ہیں، نہ علامہ تمنا عمادی مدظلہٗ کی ذاتِ گرامی سے غیر متعارف۔ اول الذکر اگر تاریخِ اسلام میں اولیت کی حیثیت رکھتی ہے تو ثانی الذکر ہمارے زمانے میں فنِ رجال کی تحقیق و تدقیق میں اولیت کا مرتبہ۔ لیکن ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ غالباً ان کے تعارف کا محتاج ہوگا۔ سو ان کی اطلاع کے لئے تحریر ہے کہ تاریخِ اسلام کی قدیم ترین کتاب، امام ابن جریر طبری کی تاریخ ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کی مبسوط تاریخ لکھی اور انہوں ہی نے قرآن کریم کی سب سے پہلی تفسیر۔ لہٰذا ان کی تاریخ کی کتاب، ام التواریخ اور ان کی تفسیر اُم التفاسیر کہلاتی ہے۔ بعد میں آنے والے مؤرخین اور مفسرین، سب انہی سے نقل کرتے ہیں۔ لہٰذا، طبری کی تاریخ، مسلمانوں کی تاریخ کا اولین ماخذ ہے۔ امام ابن جریر طبری، طبرستان کے رہنے والے ایک شیعہ اہلِ قلم تھے لیکن سُنی کی حیثیت سے متعارف ہیں اور ان کی تاریخ اور تفسیر سنیوں کی معتمد علیہ تاریخ اور تفسیر سمجھی جاتی ہے۔ ان کی ولادت تیسری صدی ہجری میں اور وفات چوتھی صدی میں ہوئی۔ انہوں نے (رسول اللہ اور صحابہؓ کے زمانے کے اتنا عرصہ بعد) اپنی تاریخ مرتب کی تو کسی تحریری مواد سے نہیں بلکہ زبانی روایات کی بنیاد پر — یعنی اس طرح کہ میں نے فلاں سے سنا اور اس نے فلاں سے سنا — اور اس طرح راویوں کا سلسلہ اوپر تک پہنچا دیا۔ اب تاریخ دان حضرات تو ایک طرف، عام اہلِ علم بھی بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ (رسول اللہ اور صحابہؓ) کے زمانے کے دو تین سو سال بعد، اس انداز سے مرتب کردہ تاریخ کی علمی حیثیت کیا قرار پاسکتی ہے؟ (حدیث کی صحیح ترین کتاب — بخاری — بھی اسی طرح مرتب ہوئی تھی) اس تاریخ میں ایسے ایسے واقعات درج ہیں جن سے (اور تو اور) خود حضور رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس و اعظم کی سیرتِ طیبہ بھی (معاذ اللہ) داغدار ہو جاتی ہے۔ اور صحابہ کبارؓ کی زندگیوں کا تو ایسا نقشہ کھینچا

گیا ہے جس سے انسان کانپ اٹھتا ہے۔ ان جلیل القدر ہستیوں کے خلاف، دشمنانِ اسلام جس قدر حملے کرتے ہیں ان کی بنیاد انہی تاریخی روایات پر ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود، ہمارا مذہبی طبقہ اس کتاب (اور اس سے ماخوذ دیگر کتب تاریخ) کو سینے سے لگائے لگائے پھرتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص ان پر تنقید کی جرأت کرے تو اسے ملحد بے دین قرار دے دیتا ہے۔

ان کتابوں پر تنقید کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ جن راویوں کا ان میں ذکر ملتا ہے ان کے حالات کی تحقیق کی جائے اور دیکھا جائے کہ تاریخی اعتبار سے وہ اپنے بیانات کے راوی ہو بھی سکتے تھے۔ اور اگر ہو سکتے تھے تو وہ قابلِ اعتماد بھی تھے؟ اس طرح کی تحقیق "اسماء الرجال" سے متعلق کہلاتی ہے۔ ہمارے زمانے میں، اس فن کے سب سے زیادہ ماہر، علامہ تمنا عمادی مدظلہٗ ہیں۔ انہوں نے بڑی کاوش و عرق ریزی سے اس باب میں تحقیق کی ہے اور ان کے مضامین طلوعِ اسلام میں اکثر و بیشتر شائع ہوئے ہیں۔ اب وہ بہت ضعیف العمر ہو چکے ہیں (ان کی عمر اس وقت (۸۰) سال سے زائد ہے) اور ضعفِ بصارت کا یہ عالم ہے کہ آتشی گلاس کی مدد کے بغیر نوشت و خواند بھی مشکل ہے۔ اس سال وہ حج بیت اللہ کی تیاری کر رہے ہیں۔ (اللہ انہیں خیریت سے لے جائے اور خیریت سے واپس لائے) لیکن جاتے جاتے، انہوں نے یہ مضمون، ان تمام موانعات کے باوجود، ارتجالاً تحریر فرمایا ہے اور لکھا ہے کہ "یہ میرا آخری مضمون ہوگا۔"

(خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔ اللہ انہیں عمر دراز عطا فرمائے)۔ اس مقالہ میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ امام ابن جریر طبری، اپنی کتاب میں جن اہم راویوں سے روایت کرتے ہیں، (جنہیں وہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ بات فلاں فلاں سے سنی) ان کی وفات، امام طبری کی پیدائش سے بھی بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اس لئے ان کا یہ بیان کس طرح قابلِ قبول ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ان روایات کو ان راویوں سے سنا تھا۔ اور جب ان کے بنیادی راویوں کا یہ عالم ہے تو تا یہ دیگراں چہ رسد! ــــ اس سے ہماری تاریخ کی اس اولین اور معتبر ترین کتاب کے قابلِ اعتماد ہونے کی حقیقت سامنے آسکتی ہے۔

جہاں تک عہدِ محمد رسول اللہ اور صحابہ کرامؓ کا تعلق ہے، ہمارا مسلک یہ ہے کہ اگر ہماری تاریخ میں کوئی ایسی بات ملتی ہے جس سے ان عظیم ہستیوں کی سیرت پر کسی قسم کا طعن پڑتا ہے تو ہم بلا تامل و توقف کہہ دیں گے کہ تاریخ کا وہ بیان غلط ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ کی ذاتِ گرامی پر ایمان لانے سے ہم مسلمان ہوتے ہیں، اور صحابہ کبارؓ کے "مومن حقاً" ہونے کی شہادت خود قرآن دیتا ہے جس پر ہمارا ایمان ہے لہٰذا اگر ایک طرف قرآن کی شہادت ہو اور دوسری طرف تاریخ کا کوئی ایسا بیان جو اس شہادت کے خلاف جاتا ہو تو ہم قرآن کی شہادت کو ترجیح دیں گے اور تاریخی بیان کو بلا توقف مسترد کر دیں گے۔ یہی وہ راہِ صواب ہے۔

جس کی طرف ہم شروع سے دعوت دیتے چلے آرہے ہیں اور کبھی منکرِ حدیث قرار پاتے ہیں اور کبھی منکرِ شانِ رسالت۔ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ)

ان تعارفی سطور کے بعد آپ علامہ تمنا عمادی کا مقالہ ملاحظہ فرمائیے۔ جسے انہوں نے اس کاوش سے تم فرمایا ہے۔ طلوع اسلام۔]

ابو جعفر محمد بن جریر الطبری تاریخ و تفسیر کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ یوں تو بعض مفسرین کے نام ان سے قبل کے لوگوں میں بھی ملتے ہیں، مگر ان کا صرف ذکر ہی کتابوں میں ہے جن کی تفاسیر کتابی شکل میں مدوّن اہلِ علم کے ہاتھوں میں موجود ہیں ان میں سب سے متقدم یہی ہیں۔

تاریخ میں ان سے پہلے واقدی و ابن اسحٰق وغیرہما بھی گزرے ہیں۔ محمد بن اسحاق کی تو صرف کتاب المغازی ہے مکمل تاریخ اسلام بھی نہیں۔ اور واقدی کذب و افترا میں ضرب المثل ہو چکا ہے اس لئے اس کی کتاب کی کوئی وقعت اہلِ علم کی نظروں میں باقی نہیں ہے۔ لے دے کر ابن جریر طبری کی کتاب "تاریخ الامم والملوک" سب سے متقدم صحیح تاریخ سمجھی جاتی ہے۔ ان کی تاریخ کی اہمیت کی بڑی وجہ ان کے شرفِ تقدم کے علاوہ یہ ہے کہ یہ ہر روایت کے راویوں کے نام بھی بتا دیتے ہیں اور ماخذ کا ذکر بھی وہیں پر کر دیتے ہیں۔ اسی لئے ان کی تاریخ بہت معتبر سمجھی جاتی ہے۔ بعد والے مؤرخین بہت حد تک انہیں کے خوشہ چیں ہیں۔ غلو اور تعصب بعد کے بعض مؤرخین میں بہت زیادہ ہے۔ یہ بھی (یعنے امام طبری) اگرچہ شیعہ تھے مگر متقدم شیعہ تھے۔ بعد والوں میں جتنا غلو اور تعصب ہے ان میں نہیں۔ اس لئے اہلِ سنت بھی ان کی کتاب کو معتبر سمجھتے ہیں[1] پھر بھی ان کی کتاب کذب و افترا سے خالی نہیں۔ خصوصاً صحابہؓ کے مشاجرات سے متعلق تو واقعات تصنیف کر کے اور راویوں کی طرف منسوب کر کے، یہ عنعنے کے ساتھ لکھتے ہیں۔ میں نے طلوعِ اسلام ہفتہ وار کراچی مؤرخہ ۷، ۱۴، ۲۱ و ۲۸ مئی ۱۹۵۵ء میں ابن جریر کے مذہب، ان کے شیوخ اور ان کے تلامذہ پر مفصل بحث کی ہے مگر شیوخ جن کا میں نے ذکر کیا ہے وہ ان کے احادیث و روایات کے شیوخ ہیں۔ تاریخ کے شیوخ کا اس مضمون میں ذکر نہیں ہے۔ ماہنامہ طلوع اسلام لاہور بابت ماہ دسمبر ۱۹۶۶ء میں ایک مضمون "ہماری تاریخ" کے عنوان سے صفحہ ۴۳ پر (ماہنامہ الرحیم سے ماخوذ) پڑھا تو جی میں آیا کہ اس سرچشمہ تاریخ کی حقیقت ناظرینِ طلوعِ اسلام پر تو کم سے کم واضح کر دوں۔

---

[1] اہلِ سنت انہیں شیعہ سمجھتے ہی نہیں، غلطی سے اہلِ سنت ہی سمجھتے ہیں۔ اس لئے تاریخ طبری خود اہلسنت کی مستند تاریخ سمجھی جاتی ہے اور اس سے ہماری تاریخ شروع سے ہی ناقابلِ اعتماد قرار پا جاتی ہے۔ (طلوعِ اسلام)

پہلے یہ بتا دوں کہ تاریخ اسلام ابن جریر طبری کے نام سے جو کتاب فارسی میں ہے جس کا اردو ترجمہ میرے مخلص و محترم دوست مولانا عبداللہ العمادی نے حیدرآباد دکن میں کیا تھا اور غالباً وہاں چھپا بھی تھا، پھر پاکستان میں بھی جسے مکتبہ رزاقی نیپئر روڈ کراچی ۲ نے شائع کیا ہے، وہ ابن جریر طبری کی طرف صرف منسوب ہے، ابن جریر طبری کی تصنیف نہیں۔ ان کی عربی تاریخ سے اس کو کوئی نسبت نہیں۔ سخت گمراہ کن کذب و افتراء سے لبریز یہ کتاب ہے۔ صرف نام "تاریخ طبری کا اردو ترجمہ" سرورق پر لکھا دیکھ کر اور عربی "تاریخ کا ترجمہ" سمجھ کر خریدتے ہیں اور گمراہ ہوتے ہیں۔ کم سے کم اتنا ہی لکھ دیا جاتا کہ فارسی تاریخ طبری کا اردو ترجمہ۔ جب بھی لوگ سمجھ سکتے تھے کہ عربی تاریخ طبری سے یہ مختلف کوئی دوسری تاریخ طبری ہے۔

طلوع اسلام ہفتہ وار والے مضمون میں میں نے لکھا ہے کہ امام ذہبی و ابن حجر وغیرہما نے جو دو ابوجعفر محمد بن جریر طبری قرار دیئے ہیں اور ایران کے ہمارے ہمعصر محدث و مجتہد علامہ عبداللہ المامقانی نے ایک اور کا اضافہ کر کے تین ابوجعفر محمد بن جریر طبری بنا ڈالے ہیں' یہ صحیح نہیں ہے۔ درحقیقت ایک ہی ابوجعفر محمد بن جریر الطبری تھے۔ رستم ان کے دادا کا نام تھا، مسلمان ہوتے تو یزیدان کا نام رکھا گیا۔ یزید اور رستم کا فرق قائم کر کے دو شخصیتیں بنا دینا غلط ہے۔

اب عربی تاریخ طبری جس کا نام تاریخ الامم والملوک ہے اس کو دیکھیے۔ اس میں کئی جگہ آپ قال ابوجعفر دیکھیں گے (یعنی ابوجعفر نے کہا) یہ ابوجعفر خود ابن جریر طبری ہیں۔ کیا وہ اپنی کتاب میں قال ابوجعفر خود اپنے متعلق لکھیں گے؟ وہ تو خود مصنف ہیں۔ جہاں قال ابوجعفر کا لفظ نہیں ہے وہاں صرف کتب اِلَیَّ السَّرِیُّ لکھا ہے کیا اِلَیَّ سے ابوجعفر طبری کے سوا کسی دوسرے کو سمجھا جا سکتا ہے؟" قَالَ اَبُوْجَعْفَر کے لفظ سے صاف ظاہر ہے کہ ابوجعفر طبری کے تلامذہ نے اس کتاب کو مدوّن کیا ہے۔ وہ کون لوگ ہیں، اس کا پتہ کون بتا سکتا ہے۔

اس کتاب میں ہر دو چار صفحے کے بعد آپ دیکھیں گے کَتَبَ اِلَیَّ السَّرِیُّ عَنْ شُعَیْب عن سیف لکھا ہے یہ سری' یہ شعیب اور یہ سیف کون کون ہیں' بغیر اظہار ولدیت و نسبت کے تو بہت زیادہ ہے لیکن کہیں کہیں سیف بن عمر بھی لکھا ہے۔ جلد سوم صفحہ ۲۸۴ میں ہے۔ قال ابوجعفر فیما کَتَبَ اِلَیَّ السَّرِیُّ بن یحیٰی یذکرُ عن شعیب بن ابراھیم اَنَّهٗ حَدَّثَهٗ عن سیف بن عمر عن خزیمة بن شجرة المُعْقَفا عن عثمان بن سوید عن سوید بن المثعبة الریاحی۔ اس جگہ ہر راوی کے تعارف کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ خزیمہ بن شجرہ، عثمان بن سُوید اور سوید بن المثعبة الریاحی باوجود تعارف کے دنیائے رجال میں مجہول بلکہ مفقود الخبر ہی ہیں۔ مگر ان کے سلسلۂ اسناد کی جو

تین اصلی کڑیاں ہیں وہ یہاں متعارف ہو گئی ہیں۔ ان میں سیف بن عمر الکوفی اور شعیب بن ابراہیم الکوفی کا تعارف توضیح ہے۔ سری بن یحییٰ کا تعارف محل نظر ہے۔ سری بن یحییٰ البصری ایک محدث تھے۔ اخباری تاریخی خبروں کے راوی کی حیثیت سے یہ متعارف نہیں ہیں۔ نہ ان کی عظمت شان سے اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ بصرہ سے کوفی راویوں سے وقائع کی خبریں حاصل کر کے طبرستان کے رہنے والے ابوجعفر طبری کے پاس مسلسل لکھ لکھ کر بھیجا کریں، جیسے سفراء کسی ملک میں بیٹھ کر وہاں سے جو معلومات حاصل کرتے تھے، اپنے ملک کے بادشاہ کے پاس اس کی رپورٹ بھیجا کرتے ہیں۔ سری بن یحییٰ تو بصرہ ہی میں بیٹھ کر کوفے سے خبریں منگوا منگوا کر بقول ابوجعفر طبری ان کے پاس بھیجتے تھے۔ وہ بھی کیا اس دنیا میں رہ کر؟ جی نہیں! بلکہ عالم برزخ سے۔ اس لئے کہ سری بن یحییٰ کی وفات ۱۶۷ھ میں ہوئی تھی۔ یعنی ابن جریر کی پیدائش سے ستاون (۵۷) برس پہلے۔ ابن جریر کی ولادت ۲۲۴ھ میں ہوئی تھی، بقولے ۲۲۵ھ میں۔ اور ان سری بن یحییٰ بصری متوفی ۱۶۷ھ کے سوا کوئی دوسرے سری بن یحییٰ دنیائے رجال میں نہیں ہیں۔ اس لئے یقیناً ان کا نام غلط اور بالکل غلط استعمال کیا گیا ہے۔

اب ذرا شعیب بن ابراہیم اور سیف بن عمر کو بھی دیکھ لیا جائے کہ ان دونوں کا تعلق سری بن یحییٰ سے کبھی رہا ہے یا نہیں، اور خود ان دونوں کے درمیان کوئی تعلق ہے یا نہیں؟

شعیب بن ابراہیم الکوفی امام ذہبی نے اپنی کتاب الضعفاء "میزان الاعتدال" اور ابن حجر نے اپنی کتاب الضعفاء "لسان المیزان" میں ان کا ذکر مختصر طور سے کیا ہے۔ ذہبی نے بس اسی قدر لکھا ہے کہ۔ رواية كتب سيف عنه ۔ وبه جهالة ۔ یعنی یہ سیف کی کتابوں کے راوی تھے۔ ان میں جہالت ہے یعنی مجہول الحال آدمی ہیں۔ ابن حجر ذہبی کی اتنی عبارت لکھ کر ابن عدی کی کتاب الکامل کی عبارت نقل کرتے ہیں۔ ليس بالمعروف له اخبار واحاديث ۔ یہ جانے پہچانے نہیں ہیں، کچھ خبریں (تاریخی روایتیں) اور کچھ حدیثیں ان کی ہیں۔ وفيه بعض النكرة وفيها ما فيه تحامل على السلف (فیہ کی ضمیر مذکر ان کی ذات کی طرف پھرتی ہے) اور ان میں بعض ناروا باتیں ہیں۔ (فیھا کی ضمیر مؤنث ان کے اخبار و احادیث کی طرف) اور ان کی تاریخی روایتوں اور حدیثوں میں اسلاف پر حملے ہیں۔" اور آپ جانتے ہیں کہ اسلاف پر حملے کرنا کس فرقے کا شیوہ ہے اور خاص کر کے کوفے میں کس جماعت کا شیوہ رہا ہے۔ اسی جماعت سے ان کا تعلق تھا۔ اس کے بعد ابن حجر ایک دوسرے شعیب بن ابراہیم کا ابن حبان کی کتاب الثقات سے نقل کر کے لکھتے ہیں کہ ابن حبان نے ان کا ذکر کر کے لکھا ہے۔ لَعَلَّهُ هُوَ۔ یعنی شاید یہ وہی ہوں۔ مگر ابن حجر لکھتے ہیں والظاهر انه غيره ۔ مگر یہ ظاہر ہے

کہ یہ ان کے سوا کوئی اور ہیں. کیسے ظاہر ہے؟ یہ نہیں لکھا. مجھ سے سنیئے. یہ ابن حبان والے شعیب بن ابراہیم محمد بن آبان البلخی متوفی سنہ ۲۴۴ھ سے روایت کرتے ہیں اور ابن جریر والے شعیب بن ابراہیم، سیف بن عمر سے روایت کرتے ہیں، اور ان شعیب سے سری بن یحییٰ بقول ابن جریر روایت کرتے ہیں جو سنہ ۱۶۷ھ میں وفات پا ب ہوتے. یعنی ابن حبان کے شعیب بن ابراہیم کے استاد سے ابن جریر کے شعیب بن ابراہیم کے شاگرد، ستتر برس پہلے گزرے تو خود ابن جریر والے شعیب، ابن حبان کے شعیب سے کتنا متقدم ہوں گے. اسی سے اندازہ کر لیجیئے.

تو ابن جریر کے شعیب بن ابراہیم الکوفی یعنی ان کے استاد الاستاد بالکل مجہول الحال شخص تھے، اور ان میں کچھ ناروا باتیں بھی تھیں اور اسلاف پر حملے بھی ان کی روایتوں میں ہوتے تھے. اس سے زیادہ ان کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا اور نہ معلوم ہو سکتا ہے. مگر ان سے لے کر جو خبریں سری عالم برزخ سے ابن جریر کے پاس بھیجتے تھے ان خبروں میں اسلاف پر حملے ظاہر یا پوشیدہ آپ دیکھتے ضرور ہیں۔

اب سیف بن عمر کو بھی پہچان لیجئے. ابن حجر نے تہذیب التہذیب جلد ۴ صفحہ ۲۹۵ سے ۲۹۶ تک ان کا ترجمہ لکھا ہے اور ان کی شان میں جو کچھ ائمہ رجال و حدیث گراں بہا کلمات ارشاد فرماتے ہیں — مثلاً ساقطٌ، ضعیف الحدیث، متروک الحدیث، ذاھبٌ، لیس بشیئٍ، غیر ثقۃ، منکر الحدیث، وغیرہ لکھنے کے بعد یہاں تک لکھ دیا ہے کہ یروی الموضوعات اور یضع الحدیث. یعنی من گھڑت حدیثیں روایت کرتے تھے اور خود حدیثیں گھڑا کرتے تھے. پھر یہ بھی لکھا ہے. اُتُّهِمَ بالزَّنْدَقَۃ. ان پر زندیق ہونے کا بھی الزام ہے. ان فضائل و مناقب کے بعد سیف بن عمر صاحب کے متعلق کچھ پوچھنا اور کچھ دریافت کرنا ہی فضول ہے. ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جو شخص جھوٹی حدیثیں بنا بنا کر رسول اللہ کی طرف منسوب کر سکتا ہے اور آخرت کی بازپرس سے مطلق نہیں ڈرتا وہ تاریخی واقعات گھڑ گھڑ کر ان کو جھوٹی روایتیں بنا بنا کر کیا اسلامی تاریخ کو مسخ نہیں کر سکتا؟ اصل یہ ہے کہ قاتلین حضرت عثمان رضؓ و قاتلین حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے ذریات کوفے میں بہت حد تک باقی تھے جنہوں نے حدیثیں اور تاریخی روایات اپنے جی سے گھڑ گھڑ کر پھیلانا اپنا مقصدِ زندگی بنا لیا تھا. آپ جو دین کے ہر رکن اور ہر مسئلے میں مختلف و متضاد حدیثیں دیکھتے ہیں ان کے راوی آپ کو کوفہ و بصرہ و مصر کے نوے فیصد ملیں گے. حجاز کے جو راوی ملیں گے ان میں نوے فیصد اولاد اسبایا (جنگی قیدیوں کی اولاد) یا آزاد کردہ غلام یا غلام ہی ملیں گے. کوفہ تو حدیثوں کے گھڑنے کی سب سے بڑی ٹکسال تھی. اس کے بعد بصرہ پھر مصر وغیرہ. غرض یہ سیف ابن عمر صاحب اسی کوفی ٹکسال میں تاریخی روایات گھڑا کرتے تھے اور شعیب بن ابراہیم دوسری جگہ کے لوگوں

سے بالمشافہ یا بذریعہ مراسلات سیف کے مکذوبات کی اشاعت کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کو محدثین کوفہ نظروں میں نہیں لگاتے تھے مگر روایت پرست مؤرخین ان کے شیدائی تھے۔

تو شعیب بن ابراہیم اور سیف بن عمر کو تو آپ پوری طرح پہچان گئے۔ مگر ان کی صرف شخصیتیں پہچانی گئیں سال ولادت و وفات ان دونوں میں سے کسی کا بھی معلوم نہ ہوا۔ سری بن یحییٰ کا سال وفات ۱۶۷ھ تھا تو یہ دونوں ضرور کچھ اس سے متقدم ہوں گے۔ خصوصاً سیف بن عمر۔ مگر ابن حجر سیف بن عمر کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ ہارون رشید کے زمانے میں ان کی وفات ہوئی۔ ہارون رشید ۱۷۰ھ میں خلیفہ ہوئے اور ۱۹۳ھ میں راہیِ جنت ہو گئے۔ سیف بن عمر کی وفات ۱۷۰ھ کے بعد و ۱۹۳ھ سے پہلے ہوئی۔ اسی درمیان میں غالباً شعیب بن ابراہیم نے بھی وفات پائی ہوگی غالباً سیف بن عمر کے بعد۔ اور سری بن یحییٰ کی وفات تو تہذیب التہذیب میں مذکور ہی ہے جس کو میں لکھ چکا ہوں۔ یعنی ۱۶۷ھ یعنی اپنے استاد الاستاد سے تین برس پہلے۔ اگر سیف نے اسی سال وفات پائی جس سال ہارون رشید نے خلافت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ شعیب اور سیف دونوں کی وفات ایک ہی سال ہوئی ہو۔ شاگرد کا استاد و استاد الاستاد سے تین برس پہلے وفات پا جانا کچھ مستبعد نہیں ہے۔ مگر سیف اور شعیب کی وفات تو ابن جریر کی ولادت سے چون پچپن برس پہلے ہوتی ہے اور جنہوں نے بلاواسطہ خود ابن جریر کو برسوں لکھ لکھ کر سیف کے اخبار کوفے سے منگوا منگوا کر بصرے سے طبرستان بھیجے بلکہ بھیجتے رہے۔ ان کی وفات ابن جریر کی پیدائش سے ستاون اٹھاون برس پہلے ہوئی۔ ع

این عجب تر ز ہر عجب باشد!

عجب تر ز ہر عجب سے بھی عجب تر

تو یہ ہے کہ امام ذہبی و ابن حجر اور دوسرے ائمہ رجال کے نزدیک شعیب بن ابراہیم و سیف بن عمر سے تعلق سری بن یحییٰ البصری کا نہیں بلکہ سری بن اسمٰعیل الہمدانی الکوفی کا بتاتے ہیں اور یہ بات قرین عقل معلوم ہوتی ہے کہ تینوں کوفی ایک ہی جماعت کے افراد معلوم ہوتے ہیں۔ جبھی تو سیف بن عمر الکوفی جیسے زندیق حدیثیں اور روایتیں گھڑنے والے کی من گھڑت روایتوں کو شائع کرتے رہتے ہیں۔ سری بن اسمٰعیل الکوفی ہی کے ترجمے میں ابن حجر لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ صفحہ ۴۵۹ سے۔ ۴۶۰ تک پڑھ جائیے) یہ شعبی (عامر بن شراحیل محدث کوفہ) کے چچیرے بھائی تھے۔ ان سے حدیثیں بھی روایت کرتے تھے۔ جب شعبی قاضی تھے تو سری بن اسمٰعیل ان کے کاتب تھے پھر شعبی کے بعد یہی سیف ان کی جگہ پر قاضی مقرر ہو گئے۔ قیس بن ابی حازم اور سعید بن وہب سے بھی حدیثیں روایت کرتے تھے اور خود ان سری بن اسمعیل سے روایت کرنے والوں میں ابن شہاب زہری کا نام بھی لیا گیا ہے۔ سری بن اسمعیل کے بارے میں محدث و امام فن رجال یحییٰ بن سعید نے کہا کہ ایک مجلس میں

مجہ پر ان کا کذب واضح ہو گیا۔ اس لئے پھر وہ ان سے بیزار ہو گئے اور عبدالرحمٰن بن مہدی تو کبھی ان کا ذکر بھی نہیں کرتے تھے۔ عبداللہ بن مبارک فرماتے تھے کہ جریر بن عبدالحمید جب سری بن اسمٰعیل، محمد بن سالم اور عبیدہ کی حدیثیں روایت کریں تو ہرگز نہ لکھو۔ ابوداؤد۔ امام احمد بن حنبل، ابن معین، امام نسائی وغیرہم نے ان کو متروک الحدیث قرار دیا ہے۔ شعبی سے ناقابل قبول حدیثیں روایت کیا کرتے ہیں۔ وغیرہ ذالک۔ سری بن اسمٰعیل خود جیسے بھی ہوں، ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ ان کی وفات کس سنہ میں ہوئی۔

شعبی کی ولادت ابن حجر تہذیب التہذیب ج۵ ص۶۸ میں سنہ ۲۰ھ[1] اور وفات سنہ ۱۰۹ھ میں لکھتے ہیں۔ سری بن اسمٰعیل ان کے کاتب تھے جب شعبی قاضی تھے۔ تو شعبی سنہ ۷۰ھ میں قاضی ہوئے تھے پچاس برس کی عمر میں، سری اس وقت کم سے کم بتیس برس کے تو ہوں گے۔ ورنہ محکمہ قضاۃ کے محرر کیا طفولیت میں ہوتے ہوں گے۔ تو یہ شعبی سے تیس برس چھوٹے ٹھہرے۔ اس حساب سے ان کی پیدائش سنہ ۵۰ھ میں ٹھہرتی ہے۔ ابن شہاب زہری سے دو تین برس بڑے ہوتے۔ جب تو زہری کو بعضوں نے ان کا شاگرد بھی کہا ہے۔ سال ولادت تو ایک حد تک متعین ہو گیا۔ شعبی کی عمر ۸۹ برس تھی۔ ان کی عمر پورے سو برس مان لیجئے تو آپ سری بن اسمٰعیل کا سال وفات سنہ ۱۵۰ھ قرار دیں گے جو قریب الی الصحۃ تخمینہ کہا جا سکتا ہے۔ اگر ڈیڑھ سو برس کی عمر بھی فرض کر لیجئے تو ابن جریر کی ولادت سے چوبیس پچیس برس پہلے سری کی وفات ٹھہرے گی۔ غرض سری بن یحییٰ ہوں حسب اقرار ابن جریر بقلم خود، یا سری بن اسمٰعیل ہوں حسب تصریح امام ذہبی و حافظ ابن حجر۔ دونوں کی وفات ابن جریر کی ولادت سے بہت پہلے ہے۔ ابن یحییٰ ستاون اٹھاون برس پہلے مرے اور ابن اسمٰعیل تقریباً پچھتر برس پہلے۔ ابن جریر کو حسب عادت تدلیس نام بدلنے کا صرف اتنا فائدہ ہوا کہ سری بن اسمٰعیل بہت مجروح اور کوفے میں بہت بدنام تھے اور سری بن یحییٰ بصری تھے اور بصرے میں نیک نام تھے اور ثقہ سمجھے جاتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ راویوں کے سال ولادت و وفات کون یاد رکھتا ہے۔ اس وقت تک رجال کی کتابیں مدون نہیں ہوئی تھیں۔ امام بخاری کی تاریخ کبیر و تاریخ اوسط و تاریخ صغیر کی عام اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ صرف صحیح بخاری کی نقلیں ان کے تلامذہ نے بہت کیں اور امام بخاری کے کچھ ہی دنوں بعد یعنی چند برسوں میں ہر شہر میں تقریباً اس کی نقلیں پہنچ گئیں اور ناقلوں نے کمی بیشی اور رد و بدل سے بھی کام لیا جس کے باعث صحیح بخاری کے نسخوں میں بہت اختلافات ہیں۔ ابن جریر کو بھی غالباً صحیح بخاری کا ایک نسخہ مل گیا تھا اسی لئے امام بخاری کے شیوخ سے خود بھی روایت کرنے لگے۔ سمجھے کہ جب امام بخاری

---

[1] سال ولادت و وفات میں مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ خود ان سے ۱۷ھ کی روایت ہے۔

میرے ہمعصر تھے تو ان کے شیوخ سے میں روایت کیوں نہیں کر سکتا ہوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر دھوکا کھایا۔ سعید بن الربیع الرشی متوفی ۲۱۱ھ امام بخاری کے اقدم اساتذہ میں سے تھے۔ ان سے بھی اپنی تفسیر میں روایت کرنے لگے حالانکہ وہ ان کی ولادت سے تیرہ برس پہلے وفات پا چکے تھے۔ اندازاً معلوم ہوتا ہے کہ ابن جریر کو مُردوں سے روایت کرنے کی کچھ عادت سی ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی تاریخ میں عمر بن شبہ سے بہت زیادہ روایت کرتے ہیں خصوصاً مشاجرات صحابہ کے واقعات جو یقیناً ابن جریر کے خود گھڑے ہوتے ہوتے ہیں، زیادہ تر عمر بن شبہ ہی سے ابن جریر روایت کرتے ہیں۔ کہیں ولدیت ظاہر کر دیتے ہیں لیکن صرف نام لکھ دیتے ہیں حدثنا عمر کہہ کے۔

عمر بن شبہ کی وفات ۲۰۲ھ میں ہے وہ ابن جریر کی ولادت سے بائیس برس پہلے وفات پا چکے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابن جریر نے کسی صوفی سے کشف قبور کی مشق حاصل کر لی تھی۔ اس کے بغیر تو مردوں سے روایت ممکن نہیں ہے مگر کشف قبور کے ذریعے مُردوں سے حضرات صوفیہ صرف کچھ باتیں کر لیتے ہیں۔ پوری داستان، داستان ہی نہیں بلکہ داستانیں نہیں سن سکتے۔ میں نے خود کشفِ قبور کی مشق حاصل کی تھی۔ آخر میں بھی تو تقریباً چالیس برس کی عمر تک صوفی رہ چکا ہوں۔ کشفِ قبور کی حقیقت سے خوب واقف ہوں۔ شیطانی وساوس کے سوا کچھ نہیں۔ جو خود اپنا ضمیر کہتا ہو صوفی سمجھتا ہے کہ مردہ کہہ رہا ہے۔ اسی لئے دو مختلف الخیال صوفی جب کسی قبر پر مُراقب بیٹھتے ہیں اور ایک ہی سوال دونوں کرتے ہیں تو دونوں میں سے ہر ایک کو اس کے خیال کے مطابق جواب ملتا ہے۔

لیکن ابن جریر کو تو مُردے عالمِ برزخ سے لکھ لکھ کر واقعات تاریخی بھیجا کرتے تھے۔ دیکھئے۔ ان کی ولادت سے پچھتر برس قبل مرنے والے سری بن اسماعیل الکوفی حسب بیان ذہبی و ابن حجر اور خود ان کے بیان کے مطابق ان کی ولادت سے ستر اٹھتر برس قبل وفات پانے والے سری بن یحییٰ البصری عالمِ برزخ سے اخبار و وقائع برسوں لکھ لکھ کر بھیجتے رہے اور یہ اپنی کتاب میں درج کرتے رہے۔ جنت کی ڈاک کا سلسلہ مدت ہوئی اور وہ بیچ میں تو دونوں جاری رہا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ اس سے بہت پہلے ابن جریر کے گھر پر جنت کی ڈاک آتی رہتی تھی۔

سری بن اسمٰعیل کے دو شیوخ

سعید بن الوہب الکوفی متوفی ۷۵ھ یا ۷۶ھ سے جنہوں نے زمانہ نبوی پایا تھا۔ اور دوسرے قیس بن ابی حازم الکوفی جنہوں نے زمانہ جاہلیت پایا تھا، آنحضرت کی خدمت میں بیعت کے لئے گھر سے چلے تھے کہ آنحضرت کی وفات ہو گئی۔ یہ وفاتِ نبوی کے بعد پہنچے اور حضرت صدیقِ اکبرؓ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ ان کی وفات ۸۴ھ یا ۸۵ھ میں ہوئی اور ایک روایت میں ہے کہ ۹۸ھ میں ہوئی۔ یعنی یہ دونوں شعبی سے بھی متقدم تھے۔ مگر

ابن جریر تو سری بن اسمٰعیل نہیں کہتے سری بن یحییٰ کہتے ہیں۔ مگر وہ بھی تو ان کی ولادت سے ستاون برس پہلے وفات پا چکے تھے۔

یہ تو ایک سرسری مطالعے سے پتہ لگا ہے۔ اگر پوری طرح ابن جریر کے راویوں کی جانچ پڑتال کی جائے تو ایسے کتنے عمر بن شبہ اور سری بن یحییٰ اور سعید بن ربیع نکلیں گے۔ مگر کون اتنی کاوش کرے۔ اور کرے بھی تو اس کو اس محنت کی کیا داد ملے گی؟ وہی تاریخ جس میں اکابر صحابہ و اساطین دین پر حملے ہیں۔ یہاں تک کہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دامن پاک خلق عظیم کو اتہامات سے آلودہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی تاریخ کو تاریخ اسلام کے نام سے تعلیم گاہوں میں پڑھایا جائے گا۔ اور اس دورِ آزاد خیالی میں نوجوانوں کو اپنے اکابر اسلاف سے یہاں تک کہ اپنے رسولؐ کی طرف سے بدظن کیا جائے گا۔

اگر کوئی تاریخی ریسرچ کے لئے اٹھے گا اور قرآنی آیات و درایت کی روشنی میں تاریخ کی کذب بافیوں کا پردہ چاک کرے گا اور صحیح واقعات کی نشاندہی کرے گا تو فوراً ایک طبقہ کے چند اشخاص اٹھیں گے، کہ یہ کتاب ہمارے عقاید کے خلاف اور فرقہ وارانہ جذبات کو ابھارنے والی ہے اس لئے ضبط کر لی جائے۔

مُحمّد وطلحہ

ابن جریر کتب الیّ السری عن شعیب عن سیف کے بعد عن محمد وطلحۃ، عموماً لکھا کرتے ہیں۔ یہ محمد اور یہ طلحہ کون ہیں؟ ان دونوں کا پتہ لگانا بھی ضروری ہے خصوصاً مشاجرات صحابہ کے واقعات اکثر وہ "محمد وطلحہ" کی مشترکہ روایت سے لکھتے ہیں۔ سیف بن عمر کے شیوخ میں "محمد وطلحہ" دو نام ضرور ملتے ہیں۔ محمد بن السائب الکلبی الکوفی جو مشہور کذاب کٹر رافضی ہے۔ جو اپنے سینے پر ہاتھ مار مار کر فخر سے کہا کرتا تھا کہ اَنَا سَبَائِیٌّ اَنَا سَبَائِیٌّ — میں عبداللہ بن سبا یہودی منافق قاتلِ حضرت عثمانؓ (حضرت طلحہؓ وحضرت زبیرؓ) کا پیرو ہوں۔ اس کے سوا کوئی دوسرا شخص "محمد" نام کا جس سے سیف بن عمر الکوفی روایت کرتے ہیں کہیں مذکور نہیں۔ مگر بعض جگہ ابن جریر تدلیس کی نیت سے یعنی نام پر کذب کا پردہ ڈالنے کے لئے عن محمد بن راشد لکھ دیتے ہیں۔ حالانکہ نہ کوئی محمد بن راشد سیف کے شیوخ میں مذکور ہے نہ کسی محمد بن راشد کے ترجمے میں یہ مذکور ہے کہ ان سے سیف بن عمر یا کوئی سیف بھی روایت کرتا ہے۔ ابن حجر تہذیب التہذیب جلد ۹ ص۱۶۱ ترجمہ محمد بن راشد الشامی میں لکھتے ہیں۔

وفی الرُّواۃِ محمد بن راشد ثلٰثۃ (بغدادیٌّ) یروی عن بقیَّۃَ بن الولید (البصری) یروی عن یونس بن عبید (واضح) یروی عن الحسن واظنہ الذی قَبْلَہٗ وَفَوَّقَ بینھما الذھبی فقال فی الاول تُکُلِّمَ فیہ وفی الاخر لا یُدْرٰی مَنْ ھُوَ۔

یعنی راویوں میں تین ہی محمد بن راشد ہیں۔ ایک بغدادی ہے جو روایت کرتا ہے

بقیہ[1] بن الولید سے۔ دوسرا بصری ہے جو روایت کرتا ہے یونس[2] بن عبید سے۔ اور ایک اور ہے جو روایت کرتا ہے حسن[3] سے۔ میں گمان کرتا ہوں کہ یہ تیسرا وہی ہے جو اس سے پہلے مذکور ہوا۔ یعنی بصری جس کو کہا کیوں کہ وہ حسن بصری سے روایت کر رہا ہے۔ ذہبی نے اول یعنی بغدادی کے بارے میں کہا کہ لوگوں نے اس کے بارے میں کلام کیا ہے۔ یعنی کچھ جرحیں لوگوں کی اس پر ہیں۔ اور دوسرے کے بارے میں کہا کہ میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے یعنی ذہبی کے نزدیک دو ہی محمد بن راشد ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو صحابہ سے روایت کرتا ہو۔ اور کسی سے بھی سیف بن عمر روایت کرتے ہیں۔ درحقیقت محمد بن السائب کو چھپانے کے لئے ایک نیا نام گھڑ کر لکھ دیا۔ درحقیقت وہ محمد بن السائب الکلبی الکذاب ہی ہے اس کے سوا کوئی دوسرا ہو نہیں سکتا غرض کوئی محمد بن راشد کسی صحابی سے روایت نہیں کرتا تو پھر وہ مشاجرات صحابہ کے چشم دید حالات کس طرح روایت کر سکتا ہے؟

اور "طلحہ بن الاعلم" ایک نام سیف بن عمر کے شیوخ میں ضرور ہے۔ مگر دنیائے رجال میں کہیں بھی طلحہ بن الاعلم کا پتہ نہیں ملتا اور نہ ابن جریر نے طلحہ کی ولدیت کا کوئی ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے کہیں ذکر کیا ہو ضعف بصارت کی وجہ سے میری نظر نہیں پڑ سکی۔ اس لئے طلحہ بن الاعلم کو لا اعلم یا واللہ اعلم کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

امام طبری، نصر بن مزاحم سے بھی روایت کرتے ہیں، اور بلا واسطہ روایت کرتے ہیں۔ حالانکہ، نصر بن مزاحم کی وفات ۲۱۲ھ میں ہوئی تھی۔ اور ابن جریر طبری، ۲۲۴ھ یا ۲۲۵ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ یعنی ابن جریر اس شخص سے بلا واسطہ روایت کرتے ہیں جو ان کی پیدائش سے بھی بارہ تیرہ برس پہلے وفات پا چکا تھا۔ لسان المیزان میں اسے کذاب اور غالی رافضی کہا گیا ہے۔ (میزان، جلد ۶۔ صفحہ ۱۵۷)

نیز ابن جریر، ابو مخنف لوط بن یحییٰ الکوفی سے بھی بہت زیادہ روایت کرتے ہیں، بالخصوص واقعات کربلا وغیرہ کے سلسلے میں، لسان المیزان (جلد ۴۔ صفحہ ۴۹۲) میں، ابو مخنف کی وفات ۱۷۰ھ سے پہلے لکھی ہے۔ بعض نے اس کا سن وفات ۱۵۷ھ بتایا ہے۔ لیکن اگر ۱۷۰ھ کو بھی، صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس کی وفات، ابن جریر کی پیدائش سے تقریب (۵۴) برس پہلے کی ہوئی۔ یہ ہے ابن جریر کی روایتی ثقاہت کا علم۔

---

[1] بقیہ بن الولید۔ مات ۱۹۷ھ، او ۱۹۸ھ واو ۱۹۹ھ

[2] یونس بن عبید البصری۔ مات ۱۳۹ھ او ۱۴۰ھ واوقبل الحارث ہو موامام الذی ابتلی اہل البصرہ بالطاعون فی ۱۳۶ھ ستہ ولیتقی فلعل یونس ولد ۱۳۶ھ او ۱۳۹ھ واللہ اعلم۔ [3] الحسن البصری ہو الحسن بن یسار ابو سعید البصری مات فی رجب ۱۱۰ھ

مختصر یہ ہے کہ ابن جریر کی تاریخ میں کذب و افترا کی بھرمار ہے۔ خصوصاً مشاجرات صحابہ کے سلسلہ میں یقیناً اپنی طرف سے واقعات تصنیف کر کے ابی السری کے عنوان کے ماتحت یا حدثنا عمر بن شبہ لکھ کر تحریر فرمایا ہے۔ اس کے کذب و افترا ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ مگر ابن جریر پھر بھی متقدم تھے۔ اس لئے یہ بعد والے مورخین جیسے فارسی والی تاریخ طبری یا مسعودی یا الامامۃ والسیاست کا مصنف جس نے اپنی کتاب کو ابن قتیبہ دینوری کی طرف منسوب کر دیا ہے، ان جیسوں کی طرح ہٹ دھرم اور کذب و افترا پر دلیر نہیں سکتے۔ ابن اثیر و ابن کثیر و ابن خلدون وغیرہم کے سامنے تو ابن جریر یا پھر واقدی ہی جیسے کذاب کی کتاب تھی۔ یا کلبی و ہشام بن کلبی جیسے افترا پردازوں کی روایات اس لئے کاٹ چھانٹ کر لکھنے پر بھی اگلے مورخین کے کذب و افترا سے کہاں تک بچ سکتے تھے۔ مجبوراً ان لوگوں کو بھی کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑا۔ اور بہت کچھ لکھ گئے۔

ضرورتِ تنقید تاریخ اسلام پر متقدمین کی جتنی کتابیں ہیں ان سبھوں کی تنقید کی ضرورت ہے۔ مگر سب سے پہلے تاریخ طبری کی تنقید کی طرف کسی صاحب توفیق کو توجہ کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ جب تک خشتِ اول سیدھی نہیں کی جائے گی دیوار کی کجی کبھی نہیں مٹ سکتی۔ بشرطیکہ رجال سے وہ واقف ہوں۔ کتب اسماء الرجال پر ان کی نظر ہو۔ اور پھر ہمت و جرأت بھی رکھتے ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ شرط اول یہ ہے کہ غلو و تعصب کے جراثیم سے ان کا دماغ محفوظ ہو۔ واللہ الموفق۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

کراچی: سندھ اسمبلی ہال نزد سعید منزل بندر روڈ
ہر اتوار کی صبح - ۹½ بجے

لاہور: ۲۵ بی گلبرگ ۲ - ہر اتوار کی صبح ۹ بجے

ملتان: میسرز شاہ محمد اینڈ سنز بیرون پاک گیٹ
ہر جمعہ - بعد نماز مغرب۔

لائلپور: پنجاب ڈیری - ۸۰ - ۴ اے۔
پیپلز کالونی - ہر جمعہ - بعد نماز مغرب۔

سرگودھا: ۷۵ - نیو سول لائن کوارٹرز - ہر اتوار ۴ بجے شام

انگلستان: بزم طلوع اسلام - ۱۰۷ سالٹ سٹریٹ بریڈ فورڈ ۸ کے زیر اہتمام یہ درس ہر اتوار کی صبح دس بجے نشر ہوتا ہے۔ بریڈ فورڈ سے باہر رہنے والے احباب نمائندہ بزم کو مندرجہ بالا پتہ پر خط لکھ کر ٹیپ بھی منگوا سکتے ہیں۔

راولپنڈی: الکوثر بلڈنگ متصل زنانہ کالج۔
مری روڈ - ہر جمعہ شام ۴ بجے

لیہ: تھل ہوٹل - نزد ریلوے اسٹیشن
ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ

بَابُ المُرَاسَلات

طلاق اور خلع

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ گذشتہ قریب ڈیڑھ ماہ سے' اخبار پاکستان ٹائمز کے جمعہ کے ایڈیشن میں سپریم کورٹ کا ایک فیصلہ قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ اس وقت تک اس کی چھ قسطیں شائع ہو چکی ہیں اور ابھی وہ سلسلہ اختتام پذیر نہیں ہوا۔ سوال زیرِ غور یہ تھا کہ کیا قانونِ شریعت کی رُو سے' عدالت اس امر کی مجاز ہے کہ وہ عورت کو اس کے خاوند کی نارضامندی کے باوجود' خُلع دلا دے۔ یہ فیصلہ فاضل جسٹس ایس۔ اے رحمٰن صاحب نے لکھا ہے۔ اور اس میں جس تفصیل سے بحث کی گئی ہے' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اس میں کس قدر کاوش اور محنت کرنی پڑی ہے اور اس پر ان کا کس قدر وقت صرف ہوا ہے۔

اس کے بعد یہ صاحب دریافت کرتے ہیں کہ کیا ہمارا قانونِ شریعت ایسا ہی ہے کہ اسکی رُو سے اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے (کہ عدالت' عورت کو خلع دلا سکتی ہے یا نہیں) اس قدر کاوش کرنی پڑتی ہے پھر جب اس بات کو بھی پیشِ نظر رکھا جاتے کہ یہ مقدمہ گذشتہ سات سال سے چل رہا ہے اور اسے عدالتِ ماتحت سے لیکر عدالتِ عالیہ تک کے تمام مراحل طے کرنے پڑے ہیں' تب جا کر یہ اصولی فیصلہ ہوا ہے کہ عدالت اسکی مجاز ہے تو یہ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ قرآن کی رُو سے اسکی پوزیشن کیا ہے اور عورتوں کو اس عذاب سے نجات دلانے کی کوئی شکل بھی ہے؟

جواب

آپ کو صرف اس ایک قانونِ شریعت کی پیچیدگی کو دیکھ کر اس قدر حیرت ہوئی ہے' یہ سلسلے کا سارا ہی ایسا ہے۔ اس میں کسی معمولی سے معمولی معاملہ کے متعلق بھی دو ٹوک فیصلہ نہیں ملے گا۔ ہمارے قانونِ شریعت کی پیچیدگیوں اور ژولیدگیوں کے متعلق (بیچارے) ان ججوں سے پوچھنا چاہیئے جنہیں اس کی رُو سے فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ اور پھر تماشہ یہ کہ جتنی مرتبہ بھی کسی معاملہ کو زیرِ بحث لایئے' ہر بار اس میں سے نئی نئی شاخیں اُبھرتی چلی

آتی ہیں۔ اور حرفِ آخر کہیں جا کر بھی نہیں ملتا۔

اس کے برعکس قرآن کی رو سے دیکھئے تو بات دو فقروں میں طے ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے نکاح کو فریقین (میاں بیوی) کے مابین معاہدہ قرار دیا ہے۔ جس طرح معاہدہ کرنے کے لئے فریقین میں سے ہر فریق صاحبِ اختیار ہوتا ہے، اسی طرح معاہدہ کو ختم کرنے کے لئے بھی ہر فریق یکساں طور پر صاحبِ اختیار ہوتا ہے۔ اس میں فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ معاہدۂ نکاح طے تو پا جاتا ہے انفرادی طور پر، لیکن اسے فسخ کرنے میں چونکہ فریقِ ثانی کے مفاد کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے اس لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس کے لئے معاشرہ کے نظامِ عدل کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ اس طرح فسخِ معاہدہ کو قرآن کی اصطلاح میں طلاق کہتے ہیں۔ (طلاق کے معنی کسی پابندی سے آزاد ہو جانے کے ہیں)۔ یہ طلاق (آزادی) جس طرح (عدالت کی رُو سے) مرد حاصل کر سکتا ہے اسی طرح عورت حاصل کر سکتی ہے۔ مرد کی طرف سے "طلاق" اور عورت کی طرف سے "خلع" کی تفریق قرآنی نہیں۔ قرآن میں تو خلع کا لفظ تک نہیں آیا۔ (اس حقیقت کو جسٹس رحمٰن صاحب نے اپنے فیصلے میں بھی تسلیم کیا ہے، کہ قرآن کریم کی رُو سے، فسخِ نکاح کے معاملہ میں، میاں اور بیوی کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔۔۔۔ پاکستان ٹائمز مورخہ ۲۴؍ ۳)۔ اگر ہمارے قوانینِ شریعت کی، قرآن کریم کی رُو سے، از سرِ نو تدوین ہو جائے تو یہ تمام مشکلات دور ہو جائیں۔

باقی رہا یہ سوال کہ بہ حالاتِ موجودہ، عورت بیچاری کو اس عذاب سے نجات دلانے کی کیا شکل ہے، تو جہاں تک نئی شادیوں کا تعلق ہے، اس کے لئے (عائلی قوانین کی رُو سے)، نکاح نامہ میں ایک شق درج کر دی گئی ہے جس میں لکھا ہے کہ

کیا عورت کو حقِ طلاق تفویض کر دیا گیا ہے۔

نکاح کے وقت اگر اس شق کے سامنے یہ لکھا لیا جائے کہ "بلا مشروط تفویض کر دیا گیا ہے" تو عورت کو فسخِ نکاح کے وہی حقوق حاصل ہو جائیں گے جو مرد کو حاصل ہیں۔ بہ حالاتِ موجودہ، یہ شق بڑی غنیمت اور بڑی اہم ہے۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ اسے چنداں اہمیت نہیں دی جاتی ۔۔۔۔ غالباً اس لئے کہ لوگوں کو عام طور پر معلوم نہیں کہ اس کے مضمرات کیا ہیں۔ اور لڑکی بیچاری کو تو قطعاً علم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے دستخط کس کاغذ پر لئے جا رہے ہیں۔ (یا اس کا انگوٹھا کہاں لگوایا جا رہا ہے۔) نکاح نامہ کو پُر کرتے وقت اس شق کا خاص خیال رکھنا چاہیئے۔ باقی رہیں وہ شادیاں جو اس سے پہلے ہو چکی ہیں، تو ان میں تو عورت بیچاری کو مرد کے رحم و کرم پر زندگی کے دن پورے کرنے پڑتے ہیں۔ ہمارا مروجہ قانونِ شریعت (خدا کا نہیں) مردوں کا بنایا ہوا ہے۔ اس لئے اس میں عورت کی جو پوزیشن ہو سکتی ہے، ظاہر ہے۔ عائلی قوانین (بہ حالاتِ موجودہ) پھر بھی غنیمت ہیں۔ لیکن مُلّا ان کے

پیچھے بھی ہاتھ دھو کر پڑا ہوا ہے۔

۲۔ بچوں کو قرآن کیسے پڑھایا جائے

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ ہمارے اسکولوں میں اسلامیات کے نام سے بچوں کو جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، اس سے ان کے ذہن میں اسلام کے متعلق جو الجھنیں پیدا ہوتی ہیں، اس کا تجربہ ہر حساس ماں باپ کو ہو رہا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے طور پر بچوں کو قرآن شریف کی تعلیم کس طرح دیں۔ یعنی بچے کی کس عمر سے اسے شروع کیا جائے اور اس کا طریقہ کیا ہو۔

جواب :-

یہ سوال بڑا اہم ہے۔ اور اسکولوں اور کالجوں میں "اسلامیات" کی چیستان نے اس کی اہمیت اور بھی بڑھا دی ہے۔ ہم نے اس مسئلہ پر غور بھی کیا ہے اور کچھ تجربے بھی — ہم جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ بچوں کو ابتدائی اسٹیج میں قرآن کریم مسلسل نہیں پڑھانا چاہیئے — ناظرہ پڑھانے کا کچھ فائدہ نہیں اور سمجھ کر پڑھنے کی ان میں ہنوز استعداد نہیں ہوتی۔ انہیں اپنے طور پر باتوں باتوں میں، روزمرہ کی زندگی سے متعلق قرآن کریم کی تعلیم سے آشنا کراتے رہنا چاہیئے — اس سلسلہ میں ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب — "اسلامی معاشرت" — کا انداز بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ اسی طرح حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے جستہ جستہ واقعات بھی انہیں بتاتے رہنا چاہیئے۔ جب بچے کی اردو اور انگریزی زبان کی استعداد اس سطح تک پہنچ جاتے جس سطح تک ہمارے ہاں بالعموم نویں یا دسویں جماعت کا طالب علم پہنچتا ہے، تو اسے عربی زبان پڑھانا شروع کر دینا چاہیئے۔ تجربہ نے بتایا ہے کہ اگر اس نہج کے مطابق جو "عربی خود سیکھیے" میں اختیار کیا گیا ہے، ہفتہ میں تین چار دن، ایک ایک گھنٹہ بھی اس کے لئے دے دیا جائے تو بچہ، سال چھ مہینے میں اتنی عربی بآسانی سیکھ سکتا ہے جس سے قرآن کریم کے الفاظ اور آیات کا ترجمہ سمجھ میں آجائے۔ اس کے بعد قرآن کریم کو مسلسل پڑھانا شروع کیا جائے۔ اس سلسلہ میں، الفاظ قرآنی کے ترجمہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ پڑھانے والے کو چاہیئے کہ ان الفاظ کا جو مفہوم "لغات القرآن" میں دیا گیا ہے، اسے اپنے الفاظ میں بچے کے ذہن نشین کراتے اور اس کے بعد پوری آیت کا مفہوم "مفہوم القرآن" سے اخذ کر کے اسے ساتھ کے ساتھ سمجھاتا جائے۔ شروع شروع میں یہ سبق، دو دو، تین تین آیات سے زیادہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ کو کالج کی تعلیم کے دوران میں بھی جاری رکھا جائے۔

جوں جوں بچہ عام تعلیم میں آگے بڑھتا جائے گا، قرآن زیادہ عمدگی سے سمجھ میں آتا جائے گا۔

اس سلسلہ میں، اس کے لئے سب سے بڑی مشکل "اسلامیات" کی تعلیم پیدا کرے گی، جو قوم

کی بدقسمتی سے، اب لازمی قرار پاگئی ہے۔ گھروں میں والدین کو چاہیئے کہ "اسلامیات" کی کتابوں کا خود مطالعہ کریں اور ان میں جو باتیں قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہوں، بچوں کو سمجھا دیں کہ وہ غلط ہیں، اور موجودہ نظامِ تعلیم کے ناقص ہونے کی وجہ سے انہیں پڑھائی جا رہی ہیں۔ (ہاں! اگر اس اصلاح کے ماتحت، جس کا ارادہ صدرِ مملکت نے حال ہی میں ظاہر فرمایا ہے، اسلامیات کا نصاب ٹھکانے کا مرتب ہو گیا تو یہ مشکل پیدا نہیں ہو گی۔)

حساس اور ذی فہم والدین پر اس باب میں بڑی ذمہ داری عاید ہوتی ہے اور انہیں اس کے لئے بڑی محنت کرنی پڑے گی۔ لیکن اگر وہ بچے کی زندگی کو صحیح خطوط پر متشکل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اس کوہ کنی اور خارہ شگافی سے مفر نہیں ہو سکتا ۔۔۔ ایک انسانی بچے کو دنیا میں لانے سے جو ذمہ داری عاید ہوتی ہے، وہ مذاق نہیں۔ یہ تو ۔۔۔۔۔ یک قطرہ خوردہ ایم و بدریا گریستیم ۔۔۔۔۔ والا معاملہ ہے۔

پیشگی خریداری

آپ ایک روپے کی کتاب منگاتے ہیں تو اس پر کم از کم بارہ آنے ڈاک کے خرچ آجاتے ہیں۔ اگر آپ اپنے آپ کو پیشگی خریداروں کی فہرست میں شامل کرلیں تو آپ کا یہ سارا خرچ بچ سکتا ہے۔ اس کے لئے صرف اتنا کرنا ہوگا کہ آپ مبلغ ایک سو روپیہ پیشگی جمع کرا دیں۔ اس کے بعد آپ جو کتاب طلب فرمائینگے۔ وہ (بغیر ڈاک خرچ) آپ کو بھیج دی جائے گی۔ رسالہ طلوع اسلام کا چندہ بھی اسی سے وضع کر لیا جائے گا۔ اور آپ کا حساب، باقاعدہ آپ کو بھیجا جائے گا۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

وہ کتابیں جن سے اسلام کا صحیح تصور سامنے آجاتا ہے

لغات القرآن — قرآن کریم کے تمام الفاظ کا مستند، واضح اور حقیقی مفہوم جس سے قرآنی تعلیم نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ قرآن کی ڈکشنری نہیں بلکہ انداز میں اس کی تفسیر ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت۔ پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد کی قیمت۔ بارہ روپے۔ مکمل سیٹ کی اجتماعی قیمت پچاس روپے۔

اسلام کیا ہے؟ — دین کے بنیادی تصورات کا نہایت حسین اور دل کش مرقع۔ قسم اعلیٰ (آٹھ روپے)، جیپ ایڈیشن (چار روپے)۔

قرآنی فیصلے — زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔

جلد اوّل (تین روپے پچیس پیسے)، جلد دوم (تین روپے پچیس پیسے)، جلد سوم (تین روپے)۔

سلیم کے نام خطوط — ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان سوالات کا نہایت سادہ اور دل کش خطوط کے انداز میں جواب۔ مذہب گزیدہ نوجوانوں کو اسلام کی طرف لانے کے لئے بڑی کامیاب کوشش ہے۔

جلد اوّل (آٹھ روپے)، جلد دوم (چھ روپے)، جلد سوم (چھ روپے)۔

انسان نے کیا سوچا؟ — افلاطون سے لیکر اس وقت تک کے مختلف مفکرین، مورخین اور سائنسدانوں نے زندگی کے مسائل کے متعلق کیا کہا ہے۔ کیا وہ انسانی دنیا کی گتھیاں سلجھا سکے ہیں؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت: بارہ روپے

نظامِ ربوبیت — انسانی زندگی کا پہلا مسئلہ روٹی کپڑے کا ہے۔ کیا یورپ یا روس کا نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر سکتا ہے؟ قرآن اس کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ معاشی دنیا کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ (چار روپے)

ابلیس و آدم — آدم۔ ملائکہ۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ وحی۔ نبوت کے متعلق قرآنی تصورات۔ (آٹھ روپے)

من و یزداں — خدا کیا ہے۔ انسان کیا ہے۔ ان دونوں کا تعلق کیا ہے۔ تقدیر کسے کہتے ہیں۔ دعا کا مفہوم کیا ہے۔ (دس روپے)

برقِ طور — صاحب ضرب کلیم اور فرعون کی آویزش۔ بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان۔ جو یوں کہئے کہ خود ہماری داستان ہے۔ (چھ روپے)

شعلۂ مستور — حضرت عیسیٰ کی بصیرت افروز داستانِ حیات۔ کیا آپ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ کیا آپ ابھی تک زندہ ہیں؟ کیا آپ دوبارہ تشریف لائیں گے؟ (چھ روپے)۔

سلسبیل — پرویز صاحب کے خطابات اور مقالات کا فکر انگیز مجموعہ۔ (آٹھ روپے)

فجر الاسلام
ضحی الاسلام
مصر کے نامور مورخ علامہ احمد امین (مرحوم) کی معرکۃ آراء تصانیف کا اردو ترجمہ۔ زمانہ قبل از اسلام سے لیکر شباب اسلام تک کی تحقیقاتی داستان۔ ان کتابوں نے عالم اسلام میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔
(فجر الاسلام (آٹھ روپے) ضحی الاسلام (پانچ روپے)

الفتنۃ الکبریٰ — مصر کے شہرۂ آفاق (نابینا) مورخ ڈاکٹر طہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہد حضرت عثمانؓ کے خونچکاں مرقع کا پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ (چھ روپے)۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

MONTHLY TOLU-E-ISLAM LAHORE

پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا ماحصل

انقلاب انگیز کتابیں

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے۔ اسلام کے متعلق اس کے دل میں سینکڑوں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اسے کوسئے نہیں۔ یہ کتاب دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خطوط کا انداز بڑا دلکش اور ہلکا پھلکا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ کاغذ۔ مجلد پہلی جلد آٹھ روپے۔ دوسری و تیسری جلد (آٹھ روپے فی جلد)

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ مجلد (بارہ روپے)

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں، بلکہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علومِ حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ خوبصورت جلد۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد بارہ روپے۔ مکمل سیٹ پچپن روپے ہیں۔

عہد آفریں کتابیں

بصیرت افروز کتابیں

سلسبیل

پرویز صاحب کے خطبات اور مقالات نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں عجیب خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ سلسبیل انہی خطبات و مقالات کا دلکش مجموعہ ہے جس میں زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ کتابت طباعت کاغذ عمدہ۔ قیمت مجلد آٹھ روپے

اسلام کیا ہے

یہ مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی، معاشی، سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور اس کی غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ (قسم اعلیٰ۔ آٹھ روپے۔ سستا ایڈیشن۔ چار روپے)

معلومات افزا کتابیں

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام — ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور